مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر: ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۰ | محرم الحرام ۱۴۴۱ھ | ستمبر ۲۰۱۹ء | شمارہ ۹

# آثار الحوبة فی اسرار التوبة

## ارتکاب گناہ پر توبہ کا اہتمام

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

# آثار الحوبۃ فی اسرار التوبۃ
# (ارتکاب گناہ پر توبہ کا اہتمام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ وعظ گناہ کے مفاسد اور توبہ کے دینی و دنیاوی فوائد کے متعلق یکم جمادی الاول ۱۳۵۰ھ بروز شنبہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے چھوٹے دولت خانہ پر بیٹھ کر تقریباً اڑھائی گھنٹہ بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً سو مرد اور خواتین پردہ میں اس کے علاوہ تھیں مولانا حمید حسن دیوبندیؒ نے قلمبند فرمایا۔ اس وعظ میں حضرت نے فرمایا کہ گناہوں سے بچنے کا طریقہ ہے کہ اللہ ورسول کی محبت دل میں پیدا کرے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جب گناہ سرزد ہو فوراً توبہ کرے۔ بڑے سے بڑا گناہ بھی توبہ سے معاف ہوجاتا ہے حتی کہ کفر وشرک بھی معاف ہوجاتا ہے اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو، نیک صحبت اختیار کرے جس سے توبہ کی توفیق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

یکم مئی ۲۰۱۹ء

# آثار الحوبۃ فی اسرار التوبۃ

## (ارتکاب گناہ پر توبہ کا اہتمام)


| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | کچھ عرصہ وعظ نہ بیان فرمانے کا سبب | ۹ |
| ۲ | مضمون بیان کرنے کے دو طریق | ۱۰ |
| ۳ | ایک وجدانی امر | ۱۱ |
| ۴ | حظ نفس میں غلو مذموم ہے | ۱۲ |
| ۵ | غلو فی البلاغت | ۱۲ |
| ۶ | گناہوں کا خاصّہ | ۱۳ |
| ۷ | ہر مسلمان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی و عقلی محبت | ۱۴ |
| ۸ | معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے | ۱۵ |
| ۹ | کمال عبدیت | ۱۷ |
| ۱۰ | عَبدیت منتہائے کمالات ہے | ۱۸ |
| ۱۱ | اہتمام مباح و منکر | ۱۹ |
| ۱۲ | اہتمام غیر اللہ میں منہمک ہونا ناپسندیدہ ہے | ۱۹ |
| ۱۳ | مبتدی، متوسط اور منتہی کی پہچان | ۲۰ |

۱۴..... مشائخ کاملین کی علامت ..... ۲۱
۱۵..... محققین اور منتہین کی عجب شان ..... ۲۲
۱۶..... مصلح بننا مشکل ہے ..... ۲۳
۱۷..... عمل اور جزا سب حق تعالیٰ شانہ کی عطا ہیں ..... ۲۴
۱۸..... حکم اور عطا ..... ۲۵
۱۹..... سبب اور مسبب کے درمیان ارتباط نہ ہونے کی مثال ..... ۲۷
۲۰..... سبب اور مسبب میں ارتباط لازم نہیں ..... ۲۸
۲۱..... عمل دخول جنت کی علّت تامّہ نہیں ..... ۲۹
۲۲..... فضیلت صدقہ ..... ۳۰
۲۳..... مفت کی قدر نہیں ہوتی ..... ۳۱
۲۴..... گناہوں سے اللہ تعالیٰ سے دُوری ہوتی ہے ..... ۳۱
۲۵..... مصائب سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب بڑھتا ہے ..... ۳۲
۲۶..... مراقبہ کی تعلیم ..... ۳۳
۲۷..... بلاؤں میں لذّت کی عجیب مثال ..... ۳۳
۲۸..... حجاب کے سات درجات ..... ۳۵
۲۹..... محققین کے علوم انبیاء علیہم السلام کے علوم کے مشابہ ہوتے ہیں .... ۳۶
۳۰..... گناہ ایک عظیم بلا ہے ..... ۳۷
۳۱..... کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا کفر کے قریب ہے ..... ۳۸
۳۲..... موافق سنت، عنداللہ محبوب ہے ..... ۴۰

۳۳..... فوراً توبہ کی ضرورت..... ۴۱
۳۴..... اپنے گناہوں کو بہت زیادہ سمجھنا تکبر ہے..... ۴۲
۳۵..... انقباض بھی گناہ کا اثر ہے..... ۴۲
۳۶..... حالتِ انقباض میں توبہ کا حکم..... ۴۳
۳۷..... ساحرین کے ایمان لانے کا سبب..... ۴۴
۳۸..... ایک نظر میں کامل کردینے کا مفہوم..... ۴۴
۳۹..... متشبہ صوفی بھی قابلِ قدر ہے..... ۴۵
۴۰..... مغفرت کی خاصیت بارود کی مانند ہے..... ۴۶
۴۱..... حکایت آصف الدّولہ..... ۴۸
۴۲..... حق تعالیٰ شانہٗ کی بے انتہا عطا وسخا..... ۴۸
۴۳..... توبہ سے متعلق دو احادیث..... ۴۹
۴۴..... حکایت شبان موسیٰ علیہ السلام..... ۵۲
۴۵..... ایک غیر محقق شیخ کی حکایت..... ۵۵
۴۶..... ہچکی بند کرنے کی عملی تدبیر..... ۵۶
۴۷..... ایک قسم کا دوام..... ۵۷
۴۸..... نیک صحبت کی برکت..... ۵۷
۴۹..... شبہات کا شافی علاج..... ۵۹
۵۰..... اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کی آسان تدبیر..... ۵۹
۵۱..... ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں..... ۶۰

۵۲..... حق تعالیٰ شانہٗ صرف طلب دیکھتے ہیں..... ۶۱
۵۳..... حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام..... ۶۲
۵۴..... گناہوں سے بچنے کا سب سے عمدہ وآسان طریقہ..... ۶۴
۵۵..... اخبار الجامعۃ..... ۶۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

ا لحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ عَسٰی رَبُّكُمۡ اَنۡ یُّكَفِّرَ عَنۡكُمۡ سَیِّاٰتِكُمۡ وَیُدۡخِلَكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۚ نُوۡرُهُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ}(۱)

## کچھ عرصہ وعظ نہ بیان فرمانے کا سبب

قبل اس کے کہ میں بیان کرنا شروع کروں ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اس وقت آپ حضرات کو شاید اس کا انتظار ہوگا کہ اب بھی حسب طرز سابق وعظ بیان کیا جائے گا۔ اور میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر شاید تعجب بھی ہوا ہو کیونکہ وعظ کے وقت کتاب ہاتھ میں لینے کا میرا پہلے معمول نہ تھا۔ تو بات یہ ہے کہ مدت ہوئی وعظ کا اتفاق نہیں ہوا چنانچہ اس وقت بھی متعارف طریق سے وعظ نہ ہوگا بلکہ

(۱) ''اے ایمان والو اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور یہ اس روز ہوگا جس روز اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے درمیان اور ان کے بائیں دوڑتا ہوگا کہتے ہیں اے ہمارے رب پوری کردے روشنی ہماری ہم کو اور معاف کر ہم کو بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے'' سورۃ التحریم:۸

کتاب میں دیکھ کر احادیث کو ترجمہ ومطلب بیان کروں گا اور چونکہ وہ بیان احادیث سے ہوگا اور میں حافظ حدیث ہوں نہیں اس واسطے کتاب ہاتھ میں لی ہے اور وجہ اس تبدیل طرز کی یہ ہے کہ چند روز سے طبیعت میں ایک قسم کا تغیر (تبدیلی) ہوا ہے جس کی وجہ سے وعظ بالکل ترک ہوگیا ہے۔ مگر وہ ایسا تغیر ہے کہ میں اس کی پوری حقیقت تو نہیں بتا سکتا مگر اس کا اثر یہ ہے کہ جو مضمون ذہن میں آتا ہے اس کے پھیلاؤ پر(۱) قدرت نہیں اور باوجود قصد کے وہ مضمون بڑھتا نہیں۔ یہ بات ایک مدت سے پیش آرہی ہے اسی وجہ سے وعظ ترک کردیا گیا۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ آج کل وعظ کے لکھنے کا کوئی انتظام نہیں اس لیے طبیعت نہیں کھلتی سو یہ وجہ بھی نہیں کیوں کہ پہلے لکھنے والے موجود بھی تھے مگر میری طبیعت اسی وقت وعظ سے ہٹ گئی تھی غرض یہ کہ ایک حالت ہے جو مجھ کو ایک مدت سے پیش آرہی ہے اور جو حالت عبد (بندہ) کو بلا اختیار پیش آتی ہے وہ خیر ہی ہوتی ہے۔ اس لیے گو اس حالت موجودہ کی حقیقت معلوم نہیں مگر چونکہ مجھ کو بغیر میرے اختیار کے پیش آرہی ہے اس لیے امید ہے کہ خیر ہی ہوگی اسی واسطے اس کا قلق بھی نہیں اس عرصہ میں بعض احباب نے فرمائشیں بھی کیں مگر ان سے بھی یہی عذر کردیا گیا۔ لیکن احباب کی طرف سے یہ جواب ملا کہ آپ بیان کا ارادہ تو کیجئے اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔

## مضمون بیان کرنے کے دو طریق

اور مجھ کو بھی یہ خیال ہوا کہ کسی مضمون کے بیان کرنے کے دو ہی طریقے ہیں ایک تو یہ کہ سوچ سوچ کر بیان کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بلا تکلف جو ذہن میں آئے بیان کردیا جائے۔ تو گو سوچ کر بیان کرنے کا اتفاق پہلے بھی کم ہوتا تھا، میرا پہلے بھی بیان کرنے کا یہی طرز رہا کہ بلا تکلف جو مضمون آیا بیان کردیا اور اس خیال کا مقتضا یہ تھا کہ اس عذر سے اثر نہ لیا جائے مگر پھر بھی اس وقت کی حالت اور موجودہ حالت میں تفاوت (فرق) معلوم ہوتا ہے وہ تفاوت یہ ہے کہ پہلے سوچنا گو تفصیلاً نہ تھا مگر اجمالاً تو تھا۔ اور اس وقت اس اجمال پر بھی قدرت نہیں۔ بس اس وقت تو اتنی ہی قدرت ہے اور یوں ہی دل چاہتا ہے کہ مختصر باتیں ہوتی رہیں جس میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کچھ

(۱) اس کو تفصیل سے بیان کرنے پر۔

وقفہ بھی ہوتا رہے۔ کچھ میں نے تقریر کی کچھ احباب نے اور اہل جلسہ نے گفتگو کی اور اس طرح سوال وجواب میں وقت پورا ہوگیا تو وہ تفاوت یہ ہے کہ جس کو میں اپنے اندر ایک مدت سے محسوس کررہا ہوں۔

## ایک وجدانی امر

اور وہ ایک وجدانی (دریافت کرنے کا) امر ہے جس کو میں پورے طور پر سمجھا نہیں سکتا کہ وہ کیا تفاوت ہے (۱) اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ تو گو میری معذوری واقعی تھی مگر جب احباب فرمائش کرتے تھے تو ان کی فرمائش پوری نہ ہونے سے بھی قلق (۲) ہوتا تھا۔ چنانچہ اس وقت سب سے پہلے ایک دوست کے صاحبزادے نے فرمائش کی اور یہ ایک گونہ ان کا احسان تھا کہ وہ کام جو میرا تھا اس کی درخواست ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ مگر انہوں نے اس عنوان سے درخواست کی کہ آپ نے پہلے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تمہارے والد صاحب آئیں گے اس وقت بیان کردیا جائے گا۔ اور قصہ یہ ہے کہ یہ تو مجھ کو یاد ہے کہ انہوں نے پچھلے زمانہ میں مجھ سے وعظ کی درخواست کی تھی مگر یہ یاد نہیں رہا کہ میں نے ان کو کیا جواب دیا تھا مگر میں مسلمان کو سچا سمجھتا ہوں اور اگر مجھ کو اپنا وعدہ یاد ہوتا تو پھر میں خود ہی تحریک کرتا اور ایفاء وعدہ کے لیے وعظ کہتا۔ اس کے بعد خود ان دوست نے بھی وعظ کی درخواست کی تو ان وجوہ سے میرا بھی دل چاہا کہ بیان کی ہمت کرہی لی جائے۔ مگر نہ تو کوئی مضمون ذہن میں تھا جس کو بیان کردیا جائے۔ نہ کسی مضمون کے پھیلاؤ کی اور دیر تک بیان کرنے کی قدرت نہ تھی کہ دفعۃً یہ سمجھ میں آیا کہ کتاب میں دیکھ کر بیان کردیا جائے۔ یہ بھی خدمت دین کی ایک صورت ہے اور پہلے بھی بعض بزرگوں کا معمول یہی تھا کہ وہ کتاب میں دیکھ کر بیان کیا کرتے تھے تو یہ رنگ بھی بزرگوں کے موافق ہے اور وہ رنگ بھی۔ غرض یہ کہ بحمداللہ اس میں بھی بزرگوں کے دائرہ سے خروج نہ ہوا اس حالت میں وعظ کے اندر اب پہلے رنگ کا انتظار نہ کرنا چاہیئے اور بیان کا جو مقصود ہے وہ الحمدللہ اب بھی محفوظ ہے۔

(۱) فرق (۲) رنج۔

## حظ نفس میں غلو مذموم ہے

گو پہلا طرز نہ ہوا اور وہ طرز مقصود بھی نہیں۔ بلکہ پہلے رنگ کی خواہش کرنا یہ بھی ایک حظ نفس ہے(۱) گووہ حظ نفس محمود ہو(۲)۔ مگر اسکے اندر غلو نہ ہونا چاہیئے جو کہ مذموم ہے، جیسے کھانا کھانا، کپڑا پہننا کہ ایک حاجت کی چیز ہے۔ لیکن اگر اس میں کوئی شخص غلو کرنے لگے تو ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً کھانے کپڑے کی فکر میں اس قدر منہمک ہوجائے کہ ضروریات میں خلل پڑنے لگے تو انہماک مذموم ہوگا۔ ایسے تقریر کا کوئی خاص طرز محمود ہے مگر مقصود نہیں۔ اور جو مقصود تھا بیان کا وہ اب بھی محفوظ ہے۔ اور جس کو میں نے غلو کہا ہے وہ تقریر کرنے والے کے لیے تو اس طرح ہے کہ اگر اس کو مضامین کی آمد نہ ہو تو تکلف کر کے گھیر گھار کے مضامین کو لائے اور بیان کرے۔

## غلو فی البلاغت

اور میرے نزدیک یہی معنی ہیں اس حدیث کے اِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ الْبَلِیْغَ مِنَ الرِّجَالِ الخ۔(۳) یعنی اس کا مصداق وہی درجہ ہے جس میں تکلف سے بلاغت کا جلب کرے تا کہ سننے والے سمجھیں کہ اس کو قوت ہے بیان میں یہی غلو فی البلاغت مبغوض(۴) ہے باقی اگر یہ قصد نہ ہو اور تکلف بھی نہ ہو بلکہ تکلف کلام میں بلاغت آجائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اور ایک غلو ہے سننے والوں کے لیے وہ یہ ہے کہ اگر بیان میں کوئی خاص رنگ نہ ہو تو اس بیان سے وہ منتفع ہی نہ ہوں(۵) بلکہ منتظر رہیں دوسرے رنگ کے غرض اس وقت متعارف وعظ نہ ہوگا بلکہ چند حدیثوں کو ترجمہ کتاب دیکھ کر بیان کردوں گا باقی یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے برکت کے لیے ہے اس کا بیان نہ ہوگا۔ اور یہ کتاب جو میرے ہاتھ میں ہے اس میں وہ احادیث موجود ہیں جن کے بیان کا ارادہ ہے اور ان احادیث کے بھی تمام اجزاء کا بیان نہ ہوگا بلکہ صرف اس جز کا بیان کردیا جائیگا۔ جو موقع کے لحاظ سے زیادہ مہتم بالشان ہوگا۔ اور ان احادیث کا صرف ترجمہ ہی پڑھا جائیگا ( کیونکہ تمام سامعین تو ترجمہ ہی سمجھ سکتے ہیں ۱۲ جامع۔ اس کے

(۱) نفس کی چاہت (۲) اگرچہ یہ چاہت پسندیدہ ہو (۳) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو جہان میں غلو فی البلاغت اختیار کرے'' سنن الترمذی: ۲۸۵۳، مشکوۃ المصابیح: ۴۸۰۰ (۴) ناپسندیدہ (۵) فائدہ ہی نہ اٹھائیں۔

بعد کتاب جمع الفوائد کھول کر ارشاد فرمایا) یہ ایک حدیث ہے جس کو حضرت عبداللہؓ نے روایت کیا ہے اور اصل میں یہ دو حدیثیں ہیں ایک میں گناہ کا ذکر ہے دوسری میں توبہ کا (اس کے بعد کتاب بند کر کے ارشاد فرمایا ۱۲ جامع)۔

## گناہوں کا خاصّہ

اس وقت ایک بات اور یاد آئی جو قابل ذکر ہے کہ اس کا تعلق بھی اسی بیان سے ہے وہ یہ کہ جب میرا بیان کرنے کا خیال ہوا تو میں نے سوچا کہ کیا مضمون بیان کرنا چاہیئے۔ میں نے اپنے ذہن میں بہت الٹ پلٹ کی مگر کوئی مضمون ذہن میں ایسا نہ آیا جو اکثر عالمین (جاننے والے) کے اعتبار سے محتاج الیہ (بیان کی ضرورت) ہو اور جی یہ چاہتا تھا اور ہمیشہ سے یہی چاہا کرتا ہے کہ ایسا مضمون بیان کیا جائے جو حالتِ غالبہ کے اعتبار سے مفید اور جامع ہو مگر بحمداللہ آج صبح ایک ایسا ہی مضمون ذہن میں آ گیا اور اسی کو بیان کے لیے اختیار کیا گیا اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی یہ حالت تو مشاہد ہے کہ ہم میں سے ہر شخص گناہوں کے اندر مبتلا ہے۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے ہم کو کوئی ضرر بھی پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ سو ایک ضرر تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ گناہوں پر عقوبت (۱) کا اندیشہ ہے یہ تو کھلا ضرر ہے (۲) اور ایک ضرر اس کے علاوہ اور ہے جو ذرا باریک ہے مگر ہے نہایت سخت۔ وہ یہ ہے کہ جس قدر نافرمانی ہوتی جاتی ہے حق سبحانہ وتعالیٰ سے بندہ کا تعلق گھٹتا چلا جاتا ہے اور اس دوسرے ضرر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر گناہوں پر عقوبت اور سزا کا اندیشہ نہ بھی ہوتا تب بھی گناہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ گناہوں کا خاصہ ہے کہ اس سے بندہ کا حق تعالیٰ شانہ سے تعلق گھٹ جاتا ہے۔ اور ہر مسلمان کے پاس اصل دولت یہی تعلق ہے حق سبحانہٗ کا جس کا دوسرا عنوان محبت ہے جو کہ فطرتاً ہر شخص کے اندر موجود ہے گو بعض کے اندر کچھ موانع ایسے عارض ہو جاتے ہیں جن کے سبب سے اس محبت کا ان کے اندر ظہور نہیں ہوتا۔ اور اس کا ظہور نہ ہونے کے سبب سے خود اسکے وجود میں شبہ پڑ جاتا ہے۔ مگر جس وقت وہ موانع مرتفع ہو جاتے ہیں (۳) اور اس محبت کا ظہور ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو نئی بات ہمارے اندر ظاہر ہوئی ہے یہ کہیں باہر سے

(۱) سزا (۲) نقصان (۳) جب وہ رکاوٹیں دور ہو جائیں۔

ہمارے اندر نہیں آئی بلکہ یہ چیز پہلے سے ہمارے اندر موجود تھی۔

## ہر مسلمان کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طبعی و عقلی محبت

مومن اگر ٹٹولے تو معلوم ہوگا کہ وہ حدیث جس کے اندر محبت کو شرط ایمان قرار دیا گیا ہے جہاں اس حدیث سے محبت کا حکم کیا گیا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے اس میں بندہ کی مدد بھی کی گئی ہے۔ یعنی اس محبت کو بندہ کے اندر پیدا بھی فرما دیا گیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے: لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه ووالده وولده والناس اجمعین او کماقال علیه الصلوٰة والسلام(۱) اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسی محبت کا وجود ہمارے اندر ہے بھی یا نہیں کیونکہ بعض واقعات ایسے ہیں جن سے انسان کو دھوکہ ہوجاتا ہے کہ میرے اندر خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں۔ مثلاً اپنا بیٹا اپنے سے جدا ہوجائے تو اس کی جدائی اور مفارقت سے باپ کو کتنا رنج اور صدمہ ہوتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہم کو زیارت نصیب نہیں ہوتی۔ جو بظاہر مفارقت ہے اس سے اتنا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر باپ مرجائے تو کتنا رنج ہوتا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کا حال سن کر اتنا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنی اولاد کا فاقہ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کا حال جب ہم سنتے ہیں تو اتنا رنج نہیں ہوتا اور صحابہ کی سی حالت محبت میں ہماری نہیں معلوم ہوتی کیونکہ صحابہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی اور عقلی دونوں قسم کا تعلق تھا اور گو عقلی تعلق اور محبت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مومن کو ہے ہی مگر کبھی اس میں شبہ ہوجاتا ہے کہ طبعی تعلق بھی ہر مومن کو حاصل ہے یا نہیں۔ سو اس شبہ کے جواب میں میرا دعویٰ ہے کہ بحمداللہ طبعی تعلق اور محبت بھی ہر مومن کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے گو صحابہ کے برابر نہ ہو۔ مگر ہے ضرور جس کا مشاہدہ کرایا جاسکتا ہے مثلاً ایک مسلمان کو اپنی اولاد سے خواہ کتنی ہی محبت ہو لیکن اگر وہی اولاد خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

(۱) ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہ ہوگا جب تک میں اس کی جان، اس کے والدین، اس کی اولاد اور سب لوگوں سے (اس کے نزدیک) پیارا نہ ہوجاؤں جیسا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' مسند احمد: ۳/ ۱۷۷، کنز العمال: ۷۰

میں کوئی گستاخی کر بیٹھے تو پھر دیکھئے باپ کو کس قدر غصہ آئے گا کہ اتنا اپنی گستاخی کرنے پر ہرگز نہ آتا۔ تو دیکھئے اگر اس باپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت نہ تھی تو اتنا غصہ کیوں آیا۔ اور اس کے تن بدن میں آگ کیوں لگ گئی اور بعض واقعات حاضرہ میں تو اس طبعی محبت کے آثار کا خوب اچھی طرح مشاہدہ ہوگیا کہ جو لوگ نماز کے پابند نہ تھے، روزہ کے پابند نہ تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف سے واقف نہ فضائل ان کو معلوم، مگر ان کے اندر بھی اس طبعی محبت کے وہ آثار ظاہر ہوئے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دوسرے کی جان لینے اور اپنی جان دینے سے زیادہ کیا آثار ہوں گے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ان کو بہت تھوڑی سی حاصل تھی اور محبت پیدا ہوتی ہے معرفت سے تو جب تھوڑی معرفت پر اتنی محبت کا ظہور ہوا تو اگر کامل معرفت ہوتی تو خدا جانے کس قدر محبت کا اظہار ہوتا۔

اب یہاں ایک شبہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ صاحب عوام تو سب کچھ کر گزرتے ہیں اور خواص دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اس کی کیا وجہ، تو کیا ان کو ایسی محبت نہیں؟ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ عوام کی نظر میں تو صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے یعنی محبت لہٰذا وہ اس کے مقتضاء پر عمل کرنے لگ جاتے ہیں اور خواص کی نظر محبت کے ساتھ حکمت پر بھی ہوتی ہے۔ یعنی خواص کی نظر میں ایک ہی چیز نہیں ہوتی بلکہ دوسری چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ بعض مواقع پر دیکھتے ہیں کہ اگر مقتضائے محبت (۱) پر عمل کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کو بمقابلہ نفع (۲) کے ضرر زیادہ پہنچ جائے گا۔ خواص کی نظر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں جو عوام کی طرح جوش ظاہر کرنے سے ان کو روکتی ہیں کیونکہ تنہا جوش کافی نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ ورنہ ناگوار واقعات سے ہیجان ان کو بھی ہوتا ہے۔

## معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے

غرض قاعدہ یہ ہے کہ معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے تو جب ناقص معرفت (۳) سے اتنی محبت پیدا ہوئی تو کامل معرفت سے کتنی ہوگی۔ پس جیسا عقلی محبت کا تحقق ہر مومن میں ہے اسی طرح واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ طبعی محبت بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر مومن کو حاصل ہے۔ البتہ جہاں اس کا ظہور نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ

(۱) محبت کے تقاضے (۲) بجائے فائدے کے نقصان ہوگا (۳) نامکمل معرفت۔

وہاں دوسری چیز اس پر غالب آجاتی ہے اور یہ محبت گویا مغلوب ہوجاتی ہے جیسے راکھ کے اندر چنگاری دبی ہوئی ہو تو ظاہر میں آگ معلوم نہ ہوگی۔ مگر اس کا وجود ضرور ہے۔ تو ظہور اور چیز ہے اور وجود اور چیز۔

پس یہ غلط ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت نہیں ہاں ظہور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ اب سمجھئے کہ یہ حدیث جس کے اندر محبت کو شرط ایمان قرار دیا گیا ہے اس سے اصل میں تو محبت کا امر (۱) کرنا مقصود ہے جس کی تحصیل ہمارے ذمہ واجب ہے مگر شانِ رحمت تو دیکھئے کہ جس بات کا ہم کو حکم دیا ہے اس کو ہمارے اندر پیدا بھی کر دیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہم کو کتنی دشواری پیش آتی تو کیا انتہا ہے اس کی رحمت کی ؎

او بد لہا ہم نماید خویش را ہم بدوز و خرقہ درویش را(۲)

کہ جس بات کا ہم کو حکم دیتے ہیں اس کو خود ہی اپنی مدد سے پورا بھی کرا دیتے ہیں۔ ممکن ہے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہو، مگر صاحب میرا تو شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ جب وہ کسی کو کسی عمل کا حکم دیتے ہیں خواہ اعمال ظاہرہ ہوں یا اعمال باطنہ تو اس میں ہمارے عمل کا بالکل وہ حال ہوتا ہے جیسے باپ بچہ کو لکھنے کے لیے کہتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ بغیر میرے لکھائے نہیں لکھ سکتا تو خود بچہ کے ہاتھ میں قلم دے کر اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اول قلم میں روشنائی لگاتا ہے پھر اس کے ہاتھ سے گلستان کی دو تین سطریں لکھوا دیتا پھر اس کو شاباشی دیتا ہے کہ ماشاء اللہ اب تو تمہیں لکھنا بھی آ گیا اس شاباشی سے وہ احمق خوشی کے مارے کودتا ہے پھاندتا ہے، کہ اب تو مجھے لکھنا آ گیا اس کے اندر اس بچہ کا کوئی کمال نہیں، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے قلم بنگر گرا جلا لیستی درمیان اصبعین کیستی(۳)

اگر ایک کاتب نے قلم سے کچھ لکھا اور قلم ناز کرنے لگے کہ میں نے ایسی عمدہ تحریر لکھی تو قلم سے کوئی پوچھے کہ احمق! یہ تو نے خود لکھا ہے یا تو کسی کے قبضہ میں ہے وہ کہتا ہے کہ میں ان انگلیوں کے قبضہ میں ہوں۔ انگلیوں سے پوچھا تم کس کے قبضہ میں ہو کہا پنجے کے قبضہ میں۔ اس سے پوچھا گیا کہ تو کس کے قبضہ میں ہے کہا ہاتھ کے، ہاتھ

(۱) حکم دینا (۲) وہ عشاق کے دلوں میں خود اپنے آپ کو ظاہر فرماتے ہیں وہی خرقہ درویش کو لیتے ہیں"
(۳) "اے قلم تو دیکھے تجھے کس نے روشن کیا تو کس کی دو انگلیوں کے درمیان ہے"

سے جو پوچھا وہ کہتا ہے میں کاتب کے قبضہ اور اختیار میں ہوں وہ جو کام چاہتا ہے مجھ سے لے لیتا ہے۔ اسی طرح آگے بڑھتے جایئے۔ کاتب ارادہ کے بعد کتابت کرتا ہے اور ارادہ اس کے قبضہ میں نہیں وہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ ارادہ کے بعد طبیعت کا درست ہونا بیماری وغیرہ جملہ موانع کا مرتفع ہونا(۱) یہ بھی کاتب کے اختیار سے باہر ہے۔ حکایت ہے کہ کوئی دیوار کے اندر میخ ٹھوک رہا تھا(۲)۔ دیوار نے میخ سے کہا کہ میں نے تیری ایسی کون سی خطا کی جس کی سزا میں تو نے میرا جگر پارہ پارہ کر دیا(۳) اور مجھ میں سوراخ کر دیا۔ میخ نے جواب دیا کہ مجھ کو مت دیکھ بلکہ اس کی طرف دیکھ جو مجھ کو ٹھوک رہا ہے۔ میں اس کے بس میں ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خفتہ از احوالِ دنیا روز و شب　　چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب(۴)

## کمال عبدیت

صاحبو! اگر ہم اپنے افعال پر ناز کریں تو ہمارا یہ ناز ایسا ہی ہوگا۔ جیسا اس بچہ کا ناز تھا جس کے باپ نے اس کا ہاتھ اپنے میں لے کر کچھ لکھوا دیا تھا، جس میں بچہ کا کوئی کمال نہ تھا اگر باپ اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ لیتا تو اس کی کیا مجال تھی جو ایک حرف بھی لکھ سکتا اسی طرح اگر ہم ناز کریں کہ نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں دین کی خدمت کرتے ہیں تو محض نادانی ہے۔ کیونکہ تم نے کیا ہی کیا ہے۔ واللہ اگر اس طرف سے مدد نہ ہوتی تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ میں اختیار کی نفی نہیں کرتا۔ اختیار تو مسلم ہے(۵) مگر حضرت وہ اختیار بھی تو دوسرے طرف سے عطا ہوا ہے۔ اختیار کی نفی کیسے کی جاسکتی ہے قرآن شریف میں جگہ جگہ اَرَادَ اور شَآءَ موجود ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ یعنی تمہاری غیر مستقل مشیت سے(۶) کچھ نہیں ہوسکتا جب تک ان کی مشیت نہ ہو۔ بعض لوگ جبریہ(۷) کے اعتقاد کو عبدیت کے قریب سمجھتے ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ عبدیت(۸) اسی میں زیادہ ہے کہ اپنی مشیت کو تسلیم کر کے

(۱) تمام رکاوٹوں کا دور ہونا (۲) کیل ٹھوک رہا تھا (۳) ''دنیا کے احوال روز وشب پوشیدہ ہیں اسی طرح حوادث زمانہ کی گردش اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے'' (۴) میرے جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (۵) تسلیم شدہ (۶) چاہت (۷) وہ فرقہ جو انسان کو مجبور محض سمجھتا ہے (۸) بندگی۔

اس کو مشیت حق کا تابع (۱) سمجھے۔ اس میں عبدیت کچھ زیادہ نہیں ہے کہ اپنی مشیت کی بالکل نفی ہی کردے اور جبر کا قائل ہوجائے۔ کمال تو یہ ہے کہ اپنے اختیار کا مشاہدہ کررہا ہے پھر اس کو ضعیف سمجھ رہا ہے۔ جیسے کسی شخص کے پاس لاکھ روپیہ ہوں مگر وہ اپنے آپ کو چار لاکھ والے کے مقابلہ میں غریب سمجھ رہا ہے۔ بخلاف اس کے جو غریب ہو کر اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے یہ کیا کمال ہے۔ اسی طرح اپنے اختیار کی بالکل نفی کرنے میں کچھ عبدیت نہیں۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ مشاہدہ ہو اپنے اختیار کا پھر اپنے اختیار کو ماتحت سمجھے دوسرے کے اختیار کے یہ ہے کمال عبدیت۔ دوسری اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے سامنے رعیت کا ایک معمولی آدمی اپنے کو بے اختیار سمجھے یہ زیادہ کمال نہیں اور اگر کوئی نواب حیدرآباد جیسا اپنے کو کسی قدر بااختیار سمجھتے ہوئے بھی اپنے اختیار کو بادشاہ کے اختیار کا تابع بنادے باکمال عبدیت ہے۔ پس جبریہ کی مثال رعیت کی سی ہے اور اہل سنت کی مثال نواب جیسی ہے کہ انسان کو باوجود خلیفۃ اللہ اور فی الجملہ بااختیار نائب سلطنت سمجھنے کے پھر بھی اس کے اختیار کو اللہ تعالیٰ کے اختیار وارادہ کا تابع مانتے ہیں اب انصاف کرلیجئے کہ عبدیت زیادہ کس میں ہے۔

## عَبدیت منتہائے کمالات ہے

پس تصوف کے اصول سے بھی اہل سنت کا مذہب عبدیت کے قریب ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک عبدیت منتہائے کمالات ہے (۲) اور عبدیت عقیدۂ اہل سنت میں اہل جبر سے زیادہ ہے۔ تو جناب یہ ہے ہماری حالت کہ دوسرے کے ہاتھ میں ہمارا ہاتھ ہے۔ جب تک وہ چاہ رہے ہیں تو ہم سے اعمال کا صدور ہورہا ہے جیسے ہمارے ہاتھ میں قلم ہو کہ اگر ہم اس کو حرکت نہ دیں تو وہ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتا اور اسی کیفیت کی تحصیل کے لیے صوفیہ نے مسئلہ وحدۃ الوجود کی تعلیم کی ہے۔ پہلے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا قرب تھا اس لیے یہی اعمال نماز روزہ وغیرہ ان کیفیات کے حصول کے لیے کافی ہوجاتے تھے بعد میں جب لوگوں کی استعداد میں ضعف (۳) واقع ہوا تو ان مراقبات واشغال کی حاجت ہوئی۔ تو حضرت یہ ہے وحدۃ الوجود جس کا لوگوں نے

(۱) اختیار کی قدرت کو تسلیم کرکے اس کو اللہ کے اختیار کے تابع سمجھے (۲) ہر کمال کی انتہاء ہے (۳) صلاحیتیں کمزور ہوگئیں

ستیاناس کردیا ہے اور کفر بنادیا ہے غایت اس مسئلہ کی صرف یہ ہے کہ سالک کی نظر میں اپنی اور ساری مخلوقات کی ہستی اور اس کی صفات وکمالات حق تعالیٰ کی ہستی وصفات وکمالات کے سامنے مضمحل ہوجائیں اور یہ حالت ہوجائے کہ ؎

مؤحد چہ بر پائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش بنا شد زکس　　ہمین ست بنیاد توحید بس (۱)

اسی حقیقت کے متعلق سعدیؒ نے کہا ہے ؎

دریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست　　کہ زیدم بیازد و عمرم بخست (۲)

## اہتمام مباح ومنکر

مگر یہاں فاعل مجازی کی طرف جس نسبت کرنے کو شرک قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد ایسی نسبت ہے، جس میں اس نسبت کے مقتضاء کا اہتمام شدید ہونے لگے اور کوئی اس میں انہماک کرنے لگے۔ جیسے کھانا ایک مباح فعل ہے۔ لذیذ چیز ہے اور جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص شب وروز اسی فکر اور اہتمام وانتظام میں مشغول رہے کہ مجھ کو لذیذ کھانے میسر آئیں تو گو اتنا اہتمام اور انہماک مباح ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ یہ تو اہتمام مباح کی مثال ہوئی اور ایک وہ اہتمام ہے جو منکر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ کسی نے کسی کے ایک تھپڑ مارا تو اس کے بدلہ میں ایک تھپڑ مارنا یہ تو مباح ہے لیکن اگر وہ بجائے ایک کے دو تھپڑ مارے گا تو یہ فعل ناجائز ہے اور اس کا اہتمام بھی منکر (برا) ہے اور شب وروز اس کی فکر میں رہنا کہ اب موقع ملے اور میں اس کے دو تھپڑ ماروں یہ انہماک منکر ہے۔

## اہتمام غیر اللہ میں منہمک ہونا ناپسندیدہ ہے

خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے اہتمام میں لگ جانا اور اسی میں منہمک ہوجانا یہ ناپسندیدہ ہے اگرچہ وہ انہماک اور اہتمام مباح کا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اس نسبت کے اقتضاء کا ایسا اہتمام شدید نہ ہو کہ اس کے اندر انہماک ہونے لگے تو اس سے محض متاثر

(۱) ''مؤحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید وخوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اس پر ہے'' (۲) اس قسم میں اس طرح کا شرک پوشیدہ ہے کہ زید نے مجھے تکلیف دی اور میری عمر ختم ہوگئی''۔

ہونے کا مضائقہ نہیں۔ غرض مراقبات واشغال کی تعلیم صوفیہ نے ان کی کیفیات کی تحصیل کے لیے کی ہے تاکہ ان اشغال ومراقبات کے ذریعہ سے ان کیفیات میں درجہ رسوخ کا حاصل ہوجائے (۱) بتلایئے اس میں انہوں نے کون سا جرم کیا مگر علماء قشر (۱) مقصود کو نہیں دیکھتے صورت اشغال (۳) پر معترض ہوتے ہیں، حالانکہ صوفیہ کا ان اشغال کو تعلیم کرنا بالکل ایسا ہے جیسا طبیب مریض کے لیے بعض دفعہ خلوت (۴) وغیرہ تجویز کرتا ہے اس میں بدعت کی کیا بات ہے۔ پھر اس نسبت کے متاثر ہونے میں اہل طریق کے مدارج مختلف ہوتے ہیں کوئی مبتدی ہے کوئی متوسط کوئی منتہی اور اس کا امتیاز عوام کا کام نہیں۔ اصل معرفت تو اہل بصیرت کو ہے باقی عوام کبھی علامات سے کچھ پہچان لیتے ہیں اور علامات بھی وہ جن کو اہل بصیرت بتلادیں۔

## مبتدی، متوسط اور منتہی کی پہچان

جیسے ایک قصہ ہے کہ کسی مرید نے اپنے شیخ سے اہل طریق کے مدارج معلوم کرنے کی درخواست کی تو شیخ نے جواب دیا کہ فلاں مسجد میں تین شخص مراقب بیٹھے ہیں۔ ان تینوں کے پاس جاکر تم ہر شخص کے ایک ایک دھول مارو (۵)۔ وہ شخص مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ تین صاحب بزرگ صورت بیٹھے ذکر وشغل میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر بہت شش وپنج میں پڑا (۶) کہ ان کے ساتھ یہ خلاف تہذیب حرکت کیسے کروں مگر چونکہ ضرورت تھی اس لیے مجبور ہوا اور آگے بڑھ کر ایک شخص کے ایک تھپڑ مارا۔ اس پر وہ صاحب اُٹھے اور اس کے بھی ایک تھپڑ مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئے اور اس سے پوچھا تک نہیں کہ تو کون ہے اور کیوں ایسی حرکت کی انہوں نے بدلہ لینے پر عمل کیا۔ اس ممتحن نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا بدلہ ایک ہی سے لیا۔ اس کے بعد یہ شخص دوسرے کی طرف بڑھا اور ان کے بھی ایک تھپڑ مارا۔ مگر وہ بیٹھے ہوئے برابر اپنے شغل میں مصروف رہے۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ ان پہلے سے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اس شخص نے ان تیسرے بزرگ

(۱) ان کیفیات میں پختگی کا درجہ حاصل ہوجائے (۲) علمائے ظاہر (۳) صوفیاء نے جو مراقبات کی شکلیں مقرر کی ہیں ان پر اعتراض کرتے ہیں (۴) تنہائی (۵) تھپڑ مارو (۶) متردد ہوا۔

کے بھی جا کر ایک تھپڑ مارا تو وہ اٹھے مگر بجائے اس کے بدلہ لیں الٹا اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگے کہ تمہاری بڑی چوٹ لگی معاف کرنا۔ خیر یہ سارا واقعہ شیخ سے جا کر عرض کیا تو شیخ نے جواب دیا کہ پہلا شخص تو مبتدی تھا۔ دوسرا متوسط تھا جو بزبانِ حال کہہ رہا تھا کہ ؎

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست(۱)

اس پر مراقبات کے اثر کا غلبہ تھا اور تیسرا شخص منتہی تھا اس نے عروج کے بعد نزول کیا تھا اور محقق تھا شفیق تھا۔ توسط کی حالت میں غلبۂ احوال و کیفیات کی وجہ سے شفقت کا غلبہ نہیں ہوتا اسی لیے مبتدی و متوسط سے اہل حقوق کے حقوق میں کوتاہی ہوجاتی ہے اگر پورا اہتمام نہ ہو۔

## مشائخ کاملین کی علامت

ہم سے بہت لوگوں نے اپنے مشائخ کے اس فعل پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے شیخ چالیس برس تک خانقاہ سے باہر نہیں نکلے۔ صاحبو! اگر یہ کوئی کمال کی بات ہوتی تو انبیاء علیہ السلام نے یہ طرز کیوں نہ اختیار کیا۔ انبیاء کا تو وہ حال تھا جو قرآن شریف میں مذکور ہے، خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار کا یہ طعن قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (۲) تو انبیاء علیہ السلام تو بازاروں تک میں چلیں پھریں اور یہ شیخ ۴۰ برس تک خانقاہ سے بھی باہر نہ نکلیں گو بظاہر عوام کے نزدیک یہ شیخ ہی زیادہ کامل معلوم ہوں گے اگر کسی غیر محقق عامی کے سامنے یہ دونوں فعل پیش کئے جائیں۔ اور یہ نہ بتلایا جائے کہ کون سا فعل کس کا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ وہ زیادہ کامل ہیں جو چالیس برس تک خانقاہ سے باہر نہیں نکلا۔ مگر جو مبصر ہوگا (۳) وہ دوسرے کو زیادہ کامل کہے گا اور اس کا راز یہ ہے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے پاس ایک آئینہ ہے جس میں سے اس کو اپنے محبوب کا چہرہ نظر آرہا ہے اور وہ اس کے اندر اپنے محبوب کے جمال جہاں آراء کا مشاہدہ کررہا ہے گویا کہ ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(۱) ''دوست (محبوب حقیقی) کی طرف سے جو پہنچتا ہے اس میں خیر ہے'' (۲) ''کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ ہماری طرح کھانا بھی کھاتا ہے اور ضروریات معاش کے واسطے ہماری طرح بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے'' سورۃ الفرقان: ۷ (۳) جس کو اللہ نے بصارت و بصیرت دے رکھی ہوگی۔

وہ شخص کیسے یہ گوارا کرسکتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف دیکھے اور آئینہ کی طرف نہ دیکھے کیونکہ اگر وہ آئینہ کی طرف نہ دیکھے گا تو اپنے محبوب کے مشاہدہ سے محروم رہے گا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جس کا یہ حال ہے کہ سارے عالم کا جز جز اس کے لیے آئینہ جمال خداوندی بن رہا ہے(۱) تو پہلے شخص کو صرف آئینہ کے اندر مشاہدہ محبوب ہو رہا تھا۔

## محققین اور منتہین کی عجب شان

اور اس دوسرے کو ہر چیز کے اندر مشاہدہ محبوب حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دوسرا شخص زیادہ کامل ہے اس میں بازار اور بیوی بچوں کا تعلق مشاہدۂ حق سے مانع نہیں ہوتا۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (۲) تو محققین اور منتہین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ان کے لیے ہر ہر چیز آئینہ جمال خداوندی بن جاتی ہے۔ غرض متوسط پر شفقت کا اتنا غلبہ نہیں ہوتا اس کو نہ رنج کے موقعہ پر زیادہ رنج ہوتا ہے نہ غصہ کے موقعہ پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ اور منتہی کا حال یہ ہوتا ہے کہ جہاں زیادہ غصہ کا موقع ہوتا ہے زیادہ غصہ آتا ہے جہاں زیادہ رنج کا موقع ہوتا ہے زیادہ رنج کرتا ہے۔ غرض وہ جہاں جیسا محل ہوتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے یہی مطلب ہے اس مضمون کا جو اس حدیث میں آیا ہے كنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصر به ويده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها (۳)

اس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ اس کا آلہ بن جاتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے آلہ اور ذی آلہ (۴) میں اختلاف نہیں ہوتا اسی طرح وہ بھی بالکل امر حق کا تابع بن جاتا ہے اور اس کا کوئی قول وفعل امر حق کے مخالف نہیں ہوتا۔ یعنی وہ کوئی کام بطور خود مستقل ہو کر نہیں کرتا۔ پس غایت وحدۃ الوجود کی اپنی ہستی کا اضمحلال ہے (۵) اور

(۱) گلستان میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بو ہے (۲) ''یہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی'' سورۃ النور: ۳۷ (۳) ''یعنی میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے الخ'' اتحاف السادۃ المتقین: ۱/ ۴۰۳ (۴) آلے والے (۵) وحدت الوجود کی حقیقت اپنی ہستی کو مٹا دینا ہے۔

اسی کیفیت کی تحصیل کے لیے وحدۃ الوجود کا مراقبہ کیا جاتا ہے (۱) جیسا اوپر مذکور ہوا۔ مگر پہلے قرب زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب استعداد قوی تھی اس لیے اس شغل کی ضرورت نہ تھی بعد میں بیشک ان چیزوں کی ضرورت ہوئی مگر اب متاخرین اس سے منع فرماتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ شغل وحدۃ الوجود کے نافع ہونے (۲) کے لیے بعد صحت عقیدہ (۳) کے دو چیزوں کی ضرورت ہے اگر کسی کے اندر ان میں سے ایک ہو دوسری نہ ہو تو یہ شغل اس کے لیے مانع طریق (۴) ہو جائے گا۔ ہاں اگر دونوں جمع ہوں تو پھر مفید ہوگا ان میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی فاعلیت اور کمال وجود کا مشاہدہ ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ اسباب سے نظر اٹھ جاتی ہے۔ دوسرے محبت، اگر مشاہدہ حاصل ہے اور محبت نہیں تو اندیشہ ہے کہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔ مثلاً کسی کا باپ مرا اب چونکہ اس کو مشاہدہ حاصل ہے اس لیے وہ اس کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھے گا مگر چونکہ اس کو ابھی محبت حاصل نہیں ہوئی اس لیے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری پیدا ہو جائے گی۔

## مصلح بننا مشکل ہے

یہ معلوم کرنا بڑے مبصر کا کام ہے (۵) کہ فلاں شخص کے لیے اس کی تعلیم مفید ہے یا مضر۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ صالح بننا آسان ہے مصلح بننا مشکل ہے۔ مرید بننا آسان ہے شیخ ہونا مشکل ہے۔ غیر محقق تو سب کو ایک لکڑی ہانکے گا وہ تو ہر شخص کو وحدۃ الوجود کی تعلیم دے گا۔ مگر محققین نے اس کے اندر غور کیا ہے اور سمجھا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کی تعلیم مضر ہوتی ہے (۶)۔ اس لیے وہ ہر شخص کو اس کی تعلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے شخص کے لیے ان کے نزدیک اسلم یہی ہے کہ وہ اسباب پر بھی نظر رکھے اور یہ سمجھے کہ میرا باپ دق میں مرگیا۔ سل میں مرگیا، ورنہ مشاہدہ سے ناگواری پیدا ہوگی اور اس سے حق تعالیٰ سے بغض پیدا ہو جائے گا۔ رہا سہا ایمان بھی جاتا رہے گا۔ خوب کہا ہے ؎

(۱) یہ مراقبہ کیا جاتا ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے باقی سب کے وجود اس کے عطا کردہ ہیں (۲) وحدت الوجود کے مراقبہ کے مفید ہونے کے لیے (۳) عقیدہ صحیح ہونے کے بعد (۴) طریق سے رکاوٹ کا باعث (۵) گہری نظر والے کا کام ہے (۶) نقصان دہ ہوتی ہے

نہ انجیر شد نام ہر میوۂ نہ مثل زبیدہ ست ہر بیوۂ(۱)

مولانا فرماتے ہیں ؎

بَر سماع راست بَرتن چیز نیست طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست(۲)

## عمل اور جزا سب حق تعالیٰ شانہ کی عطا ہیں

اہل تحقیق اس فرق کو محسوس کرتے ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ حقیقت میں حق تعالیٰ خود ہی تمام کام بندہ سے لیتے ہیں۔ ورنہ اگر اس طرف سے توفیق نہ ہو تو بندہ کیا کرسکتا ہے ہماری نماز ہمارا روزہ سب انہی کا کرایا ہوا ہے ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند(۳)

اور کہا ہے ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

حقیقت میں سب اُدھر ہی سے ہے۔ انسان کیا کرسکتا ہے اگر توفیق نہ ہو۔ اور توفیق ادھر سے ہی ہے تو اب کس قدر عنایت ہے کہ ہم کو محبت کا امر بھی ہے اور اس کے اندر ہماری امداد بھی ہے جیسے باپ اوّل اپنے بچہ کو حکم دیتا ہے کہ لکھو مگر جانتا ہے کہ یہ کیا لکھے گا اس لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے دو تین شعر کریما کے لکھوا دیتا ہے اور پھر اس لکھنے کی نسبت اس بچہ کی طرف کر دیتا ہے کہ شاباش تم خوب لکھتے ہو۔ اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اوپر سے ایک روپیہ انعام کا بھی بچہ کو دیتا ہے کیا خوب کہا ہے ؎

درد از یار ست درماں نیز ہم دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم(۴)

بیمار بھی کیا جارہا ہے اور علاج بھی ہورہا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا اور پھر اس کی توفیق بھی عنایت فرمائی روزہ کا حکم دیا۔ پھر اس کی توفیق بھی عنایت

(۱) ''ہر میوہ کا نام انجیر نہیں اسی طرح ہر بیوہ زبیدہ کے مثل نہیں'' (۲) ''تو یہ انجیر ہے جو کسی کے لیے تو مناسب ہے اور کسی کے لیے نہیں۔ بلبل کے لیے مناسب ہے کوّے کے لیے نہیں'' (۳) ''مشک افشانی تیری ہی زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحت عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگادیا ہے'' (۴) ''درد محبوب حقیقی کی طرف سے ہے اور علاج بھی انہی کی طرف سے ہے۔ میرا دل ان پر فدا ہو اور جان بھی''

فرمائی۔ پھر ان سب اعمال کی نسبت بھی ہماری طرف کردی کہ صلی فلاں، تصدّق فلاں۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ اوپر سے ہم کو اس پر انعام بھی دیتے ہیں کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یہ بدلہ اس کا جو وہ عمل کرتے تھے) حالانکہ اگر کوئی پوچھے کہ صاحب وہ نماز کس کی دی ہوئی تھی اور وہ روزہ کس کا دیا ہوا تھا تو ظاہر ہے کہ سب انہیں کا عطا کیا ہوا تھا۔ تو یہ عطا کے عوض میں عطا کیسی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی ہمیں ایک روپیہ دے ہم لے لیں، پھر اس ہمارے لے لینے پر وہ ہم کو ایک روپیہ اور دے کہ لو یہ ایک روپیہ انعام لے لو، کیا وہ پہلا روپیہ انعام نہ تھا۔ یہ تو انعام پر انعام اور عطا پر عطا ہوئی سبحان اللہ کیا شفقت ہے کیا کوئی طبیب ایسا بھی ہے کہ مریض کو نسخہ بھی لکھ کر دے اور جب وہ نسخہ پئے تو پینے کے بعد ایک روپیہ انعام بھی دے کہ لو یہ تمہارے نسخہ پینے کا انعام ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ میں بچپن میں ایک بار مسہل پینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ اگر تم پی لوگے تو ہم تمہیں ایک روپیہ دیں گے۔ بس لالچ میں آکر مسہل پی لیا(۱) اس وقت تو ان کے اس فعل کی زیادہ قدر نہ ہوئی تھی مگر اب خیال ہوتا ہے کہ واقعی ان کو ہم سے کس قدر محبت تھی کہ جس کام میں سراسر ہمارا ہی نفع تھا۔ اگر ہم مسہل نہ پیتے تو ان کا کیا نقصان تھا۔ اس پر بھی انعام دیا۔ اور انعام کا لالچ دے کر ایک نافع کام پر ہم کو لگا دیا۔ اس سے زیادہ حضرت حق کی عنایت ہے کہ ایک تو ہم کو عمل نافع (۲) کا امر فرمایا جس میں سراسر ہمارا ہی نفع ہے پھر عمل کی توفیق بھی دی پھر توفیق کے بعد اس کو ہمارا عمل فرمایا اور جب ہم کو عمل سے نفع پہنچا تو اوپر سے انعام بھی دیا۔ تو گویا عطا پر عطا ہوئی اگر غور کیا جائے تو درحقیقت وہ جزا جزا نہیں ہے بلکہ سراسر عطا ہی عطا ہے۔ مگر صورۃً جزا ہوتی ہے اس لیے نام اس کا جزا ہی رکھ دیا گیا۔

## حکم اور عطا

اسی واسطے محققین نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۳) اس ارشاد کو سن کر بعض لوگ تو مسرور (۴) ہوئے کہ ہمارے عمل پر جنت ملی اور بعض شرمندہ

(۱) دست آور دواء پی لی (۲) فائدہ مند (۳) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی'' سورۃ التوبہ: ۱۱۱ (۴) خوش۔

ہوئے اور یہ وہ ہیں جو جانتے ہیں کہ واقع میں تو نہ ہماری جان ہے نہ ہمارا مال، جان بھی انہیں کی عطا کی ہوئی ہے مال بھی انہیں کا دیا ہوا ہے۔ مگر باوجود اس کے پھر اس کو ہماری جان اور مال فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حق مشاہدہ ادا نہیں کیا اور جان و مال کو اپنا جان و مال سمجھا اس لیے انہوں نے بھی اموالکم وانفسکم (تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں) فرمایا اور اس کے عوض میں جنت کا وعدہ کیا گیا گویا یوں فرمایا کہ اچھا اگر تم ہماری چیز کو اپنی سمجھتے ہو تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تمہاری ہی جان ہے تمہارا ہی مال ہے مگر ہم سے بیع کا معاملہ کرلو۔ اللہ اکبر گویا ہمارے جہل کی بھی رعایت فرماتے ہیں کہ تم ہمارے عطا کئے ہوئے جان و مال کو اپنا ہی سمجھو مگر ہم اس کو خریدتے ہیں ہمیں دے دو مولانا فرماتے ہیں ؎

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
کے تو یابی ایں چنیں بازار را کہ بیک گل میخری گلزار را

ایک پھول کے بدلہ میں باغ دیتے ہیں اور پھول بھی ہمارے گھر کا نہیں وہ بھی انہیں کا ہے اور اسی باغ کا ہے جو بعد میں ہم کو دیا گیا۔ غرضیکہ عمل بھی ان کا عطا کیا ہوا ہے اور جزا بھی ان کی عطا ہے۔ ممکن ہے یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر صاحب میرا تو مشاہدہ ہے کہ جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں اس کو خود ہی عطا بھی فرمادیتے ہیں۔ مثلاً یہ جو حدیث میں ہے کہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (۱) اس میں محبت کا امر بھی فرمایا گیا ہے اور مدد بھی کی گئی ہے کہ خود ہی ہم کو ایسی محبت عطا بھی فرمادی۔ مگر اس طرح عطا فرمائی کہ بعض اوقات اس محبت کا اس وقت ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ ظہور چند روز کے بعد ہوگا اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ جب چند روز کے بعد اس کا ظہور ہوگا تو بندہ اس کو اپنے اکتساب کا نتیجہ سمجھ کر اس سے خوش ہوگا۔ گویا یہ خوشی اللہ میاں نے ہم کو دینا چاہی تھی اس لیے اس کا ظہور جلدی نہیں فرمایا۔

(۱) ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہ ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والدین اسکی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں (مسند احمد ۳:۱۷۷، کنز العمال: ۷۰) (۲) باہم ربط۔

## سبب اور مسبب کے درمیان ارتباط [۲] نہ ہونے کی مثال

چنانچہ جو لوگ طریق میں محنت ومشقت کرتے ہیں اور ان کو کچھ حاصل ہوتا ہے تو ابتداء میں وہ اس کو اپنے مجاہدہ کا ثمرہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں حالانکہ یہ سب انہیں کا عطا کیا ہوا ہے لیکن غور کی ضرورت ہے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہاں صرف اتنا ہوا ہے کہ سبب اور مسبب میں بدون تاثیر حقیقی کے اقتران عادی (۱) ہو گیا ہے اور سبب واقع میں بھی خود ان کا عطا کیا ہوا ہے اور مسبب بھی باقی رہا۔ سبب اور مسبب میں ارتباط (تعلق کرنا) لازم سو یہ کچھ بھی نہیں۔ بس سبب ایک جھنڈی کی طرح ہے کہ جیسے سرخ جھنڈی دکھلائی جاتی ہے تو ریل رُک جاتی ہے۔ اب اگر اتفاق سے اس وقت کوئی گنوار کھڑا ہو اس نے جو دیکھا تو بڑا تعجب کیا کہ اس سرخ جھنڈی میں بھی کیا تاثیر ہے کہ اس نے اتنی بھاری چیز کو روک دیا اب اس نے ایک سرخ جھنڈی بنا کر اپنے ساتھ رکھ لی کہ جس چیز کو روکنا چاہوں گا جھنڈی سے روک دیا کروں گا۔

ایک بار آپ چلے جا رہے تھے سامنے سے ایک بیل آ رہا تھا آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور سرخ جھنڈی دکھانے لگے کہ جب اس جھنڈی سے اتنی بھاری چیز رک گئی تو بھلا بیل کیوں نہ رکے گا۔ مگر بیل کیوں رکتا۔ بیل نے آ کر ان حضرت کے ایک سینگ مارا چاروں شانے چت ہو گئے۔ اس گنوار کی مثال وہی ہو گئی جیسے ایک احمق کی حکایت مشہور ہے کہ کوئی شخص تالاب پر بھینس کو کنارہ پر لایا مگر وہ نہ آئی۔ وہ اس کے بچے کو اس کے سامنے لے گیا۔ بچہ کو دیکھ کر بھینس باہر نکل آئی۔ ایک احمق نے یہ منظر دیکھا اتفاق سے ایک مرتبہ اس احمق کی چارپائی تالاب میں بہہ گئی تو آپ نے کیا کیا کہ دوڑے دوڑے گھر گئے اور پیڑھی (یعنی چھوٹا کٹھولا) اٹھا لائے اور اس کو سامنے کر کے پکار رہے ہیں۔ مگر بھلا اس سے کیا ہوتا۔ کسی نے کہا میاں یہ کیا حرکت کر رہے ہو کہنے لگے! اجی ایک مرتبہ ہم نے دیکھا تھا کہ ایک شخص کی بھینس کنارہ پر نہیں آتی تھی تو اس نے اس کو بچہ دکھایا تھا کہ وہ آ گئی تھی۔ تو میں نے سمجھا کہ اسی طرح پیڑھی دکھانے سے چارپائی آ جائے گی کہ یہ اس کا بچہ ہے۔ یہ تو ہنسی کی بات تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ درحقیقت اس جھنڈی نے ریل کو نہ روکا تھا بلکہ روکنے والا کوئی اور تھا جس کو اس گنوار نے نہ دیکھا تھا مولانا فرماتے ہیں ؎

(۱) کہ ایک کے کرنے پر عادۃً دوسرا اس پر مرتب ہو گیا کہ سبب اختیار کیا تو عادۃً مسبب اس پر مرتب ہو گیا

عشق من پیداؤ معشوقم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں(۱)

اور کہتے ہیں ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

عشق من پیداؤ معشوقم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں(۲)

ریل کے رکنے کو تو سب نے دیکھ لیا مگر روکنے والے کا پتہ نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

انت کالریح ونحن کالغبار یختفی الریح وغبارۂ جہار(۳)

ہوا تو نظر نہیں آتی جو غبار کو اڑائے لئے جارہی ہے مگر غبار نظر آرہا ہے کہ یہ اُڑ رہا ہے اور وہ اڑا رہا ہے۔ اسی طرح اس گنوار نے سمجھا تھا کہ سرخ جھنڈی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ریل تو روک دے۔

## سبب اور مسبب میں ارتباط لازم نہیں

اسی طرح فلسفی صاحب سمجھے ہیں کہ سبب اور مسبب میں ارتباط(۴) لازم ہے تو واقع میں لزوم محض ظاہر میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ مقرر فرمادیا ہے مگر مقرر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسباب کو مؤثر مان(۵) لیا جائے ورنہ ریلوے کے قاعدہ مقرر کرنے سے سرخ اور سبز جھنڈی کو بھی مؤثر کہنا چاہیئے ہرگز نہیں، اگر مشیت(۶) نہ ہو تو یہاں دَھرا ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ سبب اور مسبب میں اقتران ہوگیا ہے(۷)۔ تم نے صرف آگ جلادی ہے باقی کھانا قدرت نے پکایا ہے آگ نے نہیں پکایا۔ اگر آگ نہ ہوتی تب بھی کھانا پک سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں مگر چونکہ ہم کو معلوم نہیں ہے کہ مشیت کس وقت ہوگی کس وقت نہ ہوگی۔ اور ہم وقت پر کھانا پکانا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مشیت کا وقت معلوم کرنے کا طریقہ ہم کو بتلادیا۔ کہ تم چولہے پر ہانڈی رکھ کر آگ جلادیا کرو ہماری مشیت(۸) متعلق ہوجایا کرے گی ورنہ آگ کے اندر بھلا یہ

(۱) ''میرا عشق ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ ہے، دوست باہر اور فتنہ جہاں کے اندر ہے'' (۲) ''میرا عشق ظاہر ہے اور معشوق پوشیدہ ہے دوست باہر مگر اس کا فتنہ دنیا میں ہے'' (۳) ''تو ہوا کی طرح اور ہم غبار کی طرح ہیں، ہوا پوشیدہ رہتی ہے اور اس کا غبار ظاہر ہے'' (۴) تعلق (۵) مؤثر بالذات (۶) اگر اللہ نہ چاہے (۶) باہم مل گئے (۷) ہماری چاہت۔

قدرت کہاں کہ وہ کھانے کو پکا سکے۔ چنانچہ بعض دفعہ اپنی مشیت وقدرت ظاہر کرنے کو اللہ تعالیٰ اسباب کو معطل (۱) بھی کر دیتے ہیں اسی طرح ہماری ریاضت ومجاہدہ بھی کیا چیز ہے جس پر کوئی ثمرہ مرتب ہو۔ یہ سب کچھ ان کی عطا ہے جیسے کسی سخی نے رائی کا دانہ لے کر کسی کو ایک گاؤں دے دیا۔ تو اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ رائی کا دانہ اس قابل تھا کہ اس کے عوض ایک گاؤں دیا جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہ جائے گا بلکہ سب رحمت سے جائیں گے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بھی؟ واقعی یہ بڑا ضروری سوال تھا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

## عمل دخول جنت کی علّت تامّہ نہیں

حضرت عائشہؓ نے ایسے ایسے سوالات کر کے ہمارے لیے راستہ صاف کر دیا تو حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ولا انا (المعجم الکبیر للطبرانی: ۷/ ۳۷۰) کہ ہاں میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا بلکہ محض فضل ورحمت سے جاؤں گا۔ اور یہ جواب بڑی علامت ہے۔ حضور ﷺ کے سچا ہونے کی کہ باوجود یہ کہ حضور ﷺ کے کیا کیا فضائل ہیں کیسے کیسے کمالات ہیں مگر اس پر بھی صاف صاف فرماتے ہیں ولا انا جھوٹا مدعی ہرگز یہ جواب نہیں دے سکتا۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ عمل علّت تامہ نہیں دخول جنت کی (۲) اور ہو بھی کیسے سکتی ہے اس لیے کہ جتنی بڑی جزا ہے اتنا ہی بڑا عمل تھوڑا ہی ہے۔ ہمارے اعمال تو اس نوکر کے کام کے برابر بھی نہیں جو چار روپے ماہوار پر آپ کا کام کرتا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک صبح سے شام تک محنت ومشقت کرتا ہے تو آپ اس کو چار روپے دیتے ہیں اگر حق تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح برتاؤ فرماتے تو شاید ہمارے عمر بھر کے اعمال کی قیمت چار آنے بھی نہ ہوتی۔ پھر اس پر غیر متناہی نعمتیں عطا فرمانا جو ختم ہی نہیں ہوں گی اور جن کے متعلق ارشاد ہے کہ وما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (۳) تو کیا نعمتیں ہمارے اس عمل کا عوض ہو سکتی ہیں

(۱) بیکار (۲) عمل کرنے کے بعد جنت میں داخلہ ضروری نہیں (۳) ”جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی دل میں اس کا وسوسہ ہوا“ مسند احمد: ۲/ ۴۳۸، الترغیب والترہیب: ۴/ ۵۲۱۔

ہرگز نہیں اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے آپ ترازو کے ایک پلے میں تو رائی کا دانہ رکھیں اور دوسرے میں چکی کا پاٹ۔ بھلا ان دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے؟ اور یہ مثال بھی پوری مثال نہیں کیونکہ چکی کا پاٹ پھر متناہی ہے حساب کر کے رائی کے دانہ سے اس کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے اور نعمائے آخرت غیر متناہی ہیں جس سے عمل متناہی کو کچھ بھی نسبت نہیں۔ مگر حق تعالیٰ ہمارے اس رائی کے دانہ کو بھی اتنا وزنی فرمادیتے ہیں جتنا وہ چکی کا پاٹ ہے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھ جائیں کہ ان کے پاس اتنے اعمال ہیں۔

## فضیلت صدقہ

حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی راہ خدا میں ایک چھوارا صدقہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر بڑھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ بھلا احد پہاڑ کے برابر چھوارے کے ٹکڑے کر کے تو دیکھئے کتنے ہوں گے۔ خواہ حجم میں کیجئے یا وزن میں۔ اگر وزن میں کئے جائیں گے تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے مگر چھوارے کے اس قدر بڑھنے کے بعد بھی جزا اس سے ایسی ہی بڑھی ہوئی ہے جیسے اس وقت تھی جب کہ چھوارا اپنی اصلی حالت پر تھا کیونکہ جزا غیر متناہی ہے مگر خیر عمل کے بڑھانے سے فی الجملہ جزا و عمل میں تقارب (۱) تو ہوگیا۔ تو علت تامہ دخول جنت کی رحمت تامہ ہے (۲) اللہ تعالیٰ چاہتے ہی ہیں کہ ہم جنت میں جائیں اس لیے عمل کا حکم دیتے ہیں اور پھر اس عمل کی توفیق بھی مرحمت فرماتے ہیں تو محض ان کی رحمت ہی سبب ہے دخول کا۔ ورنہ ہمارے اعمال تو جو کچھ ہیں سب انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے ہی ہم کو اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرمائی ہے۔ اور یہ محبت انہی کی پیدا کی ہوئی ہے مگر اس کا ظہور اب ہوا ہے۔ ہمارے اکتساب (۳) کے بعد تاکہ ہمارا جی خوش ہو کہ یہ ہماری کمائی ہے۔ اور حکمت اس میں یہ ہے کہ ہم اس کی قدر کریں اور اس کو نعمت سمجھیں۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت حاصل ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔

(۱) کچھ قرب (۲) دخول جنت کی اصل علت اللہ کی رحمت ہے (۳) ہمارے عمل کرنے کے بعد۔

## مفت کی قدر نہیں ہوتی

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب سے جنہوں نے ایک کتاب طبع کرائی تھی فرمایا تھا کہ بھائی اس کو بلا قیمت کسی کو مت دینا ورنہ لوگ اس کو ردی میں ڈال دیں گے۔ مشہور ہے کہ ایک شخص دھوڑی (۱) کا جوتہ دوشالہ (۲) سے جھاڑ رہا تھا کسی نے وجہ پوچھی تو کہا جوتہ میری کمائی کا ہے اور دوشالہ ابا جان کی کمائی کا۔ تو یہ حکمت ہے اکتساب کے بعد ظاہر ہونے میں اور سچ تو یہ ہے کہ میرا یہ کہنا بھی بے ادبی ہے کہ اس میں یہ حکمت ہے کیونکہ تمام حکمتوں کا احاطہ کسی نے تھوڑا ہی کرلیا ہے۔ تو اصل میں اور کیا کیا حکمتیں ہوں گی مگر تقریب فہم کے لیے ایک آدھ مثال دے دی گئی ہے۔ تو اصل محبت تو ان ہی کی عطا ہے اور وہی اس کی حفاظت فرماتے ہیں پھر بھی چونکہ یہ نعمت نہایت قابلِ قدر ہے اس لیے ہم کو بھی جو چیزیں اس کو ضعیف کرنے والی ہیں ان سے ہم کو بھی بچنا چاہیئے اسی کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں یہی آج کے بیان کا مقصود ہے۔ اب ذرا سنئے کہ وہ چیز کیا ہے جو اس محبت کو ضعیف (۳) کرتی ہے۔

## گناہوں سے اللہ تعالیٰ سے دُوری ہوتی ہے

سوہ وہ بُعد عن الحق (اللہ تعالیٰ سے دوری) ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ بُعد کس چیز سے ہوتا ہے تو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ مصائب سے بُعد نہیں ہوتا۔ بلکہ بُعد صرف گناہ سے ہوتا ہے جس کی طرف کبھی نظر بھی نہیں جاتی۔ جسمانی اور مالی وآفاتی بلاؤں سے تو قرب بڑھتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے مؤمن کو عین بلاء کے وقت حق تعالیٰ کی طرف توجہ پہلے سے زیادہ ہوجاتی ہے مگر بلا سے مراد وہ ہے جو غیر اختیاری ہو۔ اور اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں مصیبت مول لے تو وہ گناہ ہے اس سے بُعد ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسه (۴) صحابہ نے اس کی تفسیر دریافت فرمائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یتحمّل من البلاء لمالا یطیقه یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا یہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں ناقابل برداشت مصیبت میں پڑے سو یہ حقیقت میں معصیت ہے قرب نہیں۔

(۱) موٹے چمڑے کا جوتا (۲) عمدہ چادر سے (۳) کمزور (۴) مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۳، کنز العمال: ۵۳۰۴۔

## مصائب سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب بڑھتا ہے

مگر جو مصیبت غیر اختیاری ہو اس سے کچھ بُعد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تو اس کی ہر قسم کی مدد بھی کی جاتی ہے اور وہ حال ہوتا ہے کہ ؎

درد از یا رست و درماں نیز ہم دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم (۱)

اس سے تو قرب بھی بڑھتا ہے اور محبت بھی بڑھتی ہے۔ چنانچہ ایام مصیبت کی حالت کو یاد کر کے دیکھ لیجئے اور خیر ہم لوگ تو جیسے مصائب میں مبتلا ہیں اسی طرح گناہوں میں بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر جو حضرات ہم سے پہلے گزر چکے ہیں مثلاً انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ان کے حالات میں غور کیجئے کہ ان پر کیسی کیسی شدتیں ہوئی ہیں، ہائے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

زاں بلاہا کا نبیاء برداشتند سر بچرخ ہفتمیں برداشتند (۲)

یعنی انبیاء علیہم السلام پر کیسی کیسی ایذائیں امت کی طرف سے ہوئی اور وہ بلائیں ان کی ترقی کا سبب بنیں اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ بعض امتوں کے لوگ آروں سے چیرے گئے ہیں مگر ان لوگوں کے استقلال (۳) میں فرق نہ آیا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر کس چیز نے ان کو مستقل بنائے رکھا وہ کیا چیز تھی وہ محبت تھی کیونکہ ؎

از محبت تلخہا شیریں بود (۴)

بجرم عشق توام میکشند وغوغائیست تو نیز برسر بام آ کہ خوش تمشائیست (۵)

یعنی عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ ذرا آپ بھی آ کر یہ تماشا دیکھ جاتے تو اچھا تھا کہ مجھے صرف آپ کی محبت کے جرم میں قتل کیا جا رہا ہے اس کے سوا اور کوئی جرم میں نے نہیں کیا وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۶) اور عاشق کی اس درخواست کا منشا یہ ہے کہ جب تم اپنی آنکھوں سے مجھ کو دیکھو گے تو تمہارے دیکھنے سے مصیبت مجھ پر آسان ہو جائے گی۔ خصوص جب تم مجھ کو دیکھو گے

(۱) ''درد محبوب حقیقی کی طرف سے ہے اور علاج بھی ان کی طرف سے ہے تو میرا دل بھی ان پر قربان اور جان بھی'' (۲) ''یہ مصائب حضرات انبیاء علیہم السلام نے برداشت کئے بلکہ ساتویں آسمان کے سر تک برداشت کئے'' (۳) مستقل مزاجی (۴) ''محبت کے باعث تلخیاں میٹھی (خوشگوار) ہو جاتی ہیں'' (۵) تیرے عشق کے جرم میں میں یہ غم و پریشانی برداشت کر رہا ہوں تو بھی دروازے پر آ کر دیکھ خوب تماشا لگا ہوا ہے (۶) سورۃ البروج: ۸

اور میں تم کو دیکھوں گا تو عشق کی آگ اور بڑھے گی۔ کیونکہ پھر دونوں طرف سے علاقہ ہوجائے گا اور لذت عشق میں مصائب کا تحمل آسان ہوجاتا ہے۔

## مراقبہ کی تعلیم

اور میرے خیال میں قرآن شریف میں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فاصبر (پس صبر کیجئے) کے ساتھ فانك باعيننا (بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں) سنایا گیا ہے وہ درحقیقت ایک مراقبہ کی تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت یہ بات پیش نظر رکھئے کہ خدا دیکھ رہا ہے اس کا بھی یہی حاصل ہے کہ اس مراقبہ سے بلا کا تحمل (۱) آسان ہوجائے گا۔ میرا ذوق بھی کہتا ہے کہ فانك باعيننا علت ہے فاصبر کی اور علیت کا تحقق جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ اس مضمون کو صبر میں دخل ہو اب آیت کا حاصل یہ ہوا کہ محبوب کا مصیبت کے وقت عاشق کو دیکھنا اور اس کا یہ سمجھ لینا کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔ عاشق کے لیے موجب لذت ومزیل کلفت (۲) ہوتا ہے۔ بہرحال محبت وہ چیز ہے کہ اس سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ آروں سے چیرے گئے مگر ان کے استقلال میں فرق نہ آیا اور خیر یہ حضرات تو تھے ہی مگر اللہ کے بندے اب بھی موجود ہیں کیا وہ مصائب نہیں اٹھاتے۔

## بلاؤں میں لذّت کی عجیب مثال

بحمد اللہ وہ بھی عین بلاؤں کے ہجوم کے وقت اپنے قلب میں ایک خاص ذوق اور ایک خاص لذّت پاتے ہیں اور اس پر کسی کو تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ بلا تو ایک تلخ چیز ہے تلخی میں کیا ذوق؟ (۳) تلخی میں کیا لذّت؟ محسوسات میں اس کی نظیر دیکھئے کہ مرچوں میں کیسی لذت ہے جو لوگ مرچیں کھاتے ہیں ان سے دریافت کیجئے حالانکہ اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ آنکھوں سے بھی پانی آرہا ہے منہ سے بھی سی سی کررہے ہیں۔ مگر کھاتے چلے جارہے ہیں کوئی پوچھتا ہے ارے بھائی کیا ہوگیا خیر تو ہے؟ کہتے ہیں کچھ نہیں آج سالن میں مرچیں بہت ہوگئیں اب اگر وہ یہ کہے کہ پھر سالن نہ کھایا ہوتا تو وہ

(۱) مصیبت برداشت کرنا آسان ہوجائے گا (۲) لذت کا باعث اور پریشانی کو دور کرنے والا (۳) مصیبت تو کڑوی ہے کڑواہٹ میں کیا مزہ۔

یہی کہے گا کہ واہ مرچ بھی کوئی چھوڑنے کی چیز ہے۔ جو لوگ تمبا کو کھاتے ہیں وہ اس کی تلاش میں ہر وقت رہتے ہیں کہ کہیں سے تیز تمبا کو ملے۔ اگر کسی دوکان میں مل جاتا ہے تو کہتا ہے کہ بھائی اس سے بھی زیادہ کڑوا ہو تو وہ دو۔ ذرا آپ تو تمبا کو کھا کر دیکھئے ذرا پتی ہی سے پت اچھلنے لگیں گے (۱) ورنہ چکر اور متلی تو ضرور ہو جائے گی اور جو عادی ہیں ابتداء میں ان کو بھی سب کچھ ہوا تھا۔ مگر اب ان کو تمبا کو میں کیسی لذت آتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اب یہاں تلخی اور لذت کیسے جمع ہو گئے۔ مگر حیرت ہے کہ آپ یہاں تعجب نہیں کرتے اور اللہ کے بندوں پر آپ کو تعجب ہوتا ہے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ حق تعالیٰ کی محبت میں یہ خاصیت ہے کہ تلخ کو شیریں کر دیتی ہے، دشواریوں کو آسان کر دیتی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ صاحب اگر یہ بات ہے تو پھر اولاد کے مرنے کے وقت انبیاء علیہم السلام کے آنسو کیوں نکلے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے اندر مختلف طبائع رکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ تو وہ آنسو ناگواری سے نہیں نکلے بلکہ ترحم سے نکلے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اپنے بچہ کی اس حالت کو دیکھ نہ سکے اگر آنسو نہ نکلتے تو بچہ کا حق ادا نہ ہوتا۔ کیونکہ ترحم بچہ کا حق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر مرچوں سے آنسو کیوں نکلتے ہیں تو تم یہی کہو گے ناں کہ صاحب مرچ کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے آنکھوں سے اور ناک سے پانی نکلا کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اسی طرح بعض بلا میں بھی یہ خاصیت ہے کہ اس سے آنسو نکلا کرتے ہیں اور باوجود آنسو نکلنے کے وہ دل سے ناراض نہ ہو گا جیسا مرچ کھانے والا دل سے ناراض نہیں ہوتا گو آنکھیں رو رہی ہیں، رضاء والم جمع ہو سکتے ہیں (۲) دیکھئے ایک شخص ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے کہ میرا پھوڑا نکلا ہے اس میں آپریشن کر دیجئے ڈاکٹر نشتر لگاتا ہے تو مریض ایک چیخ مارتا ہے۔ پھر جب آپریشن ہو چکتا اور مرہم پٹی کر کے ڈاکٹر فارغ ہو جاتا ہے تو یہ مریض صاحب جیب سے پچاس روپے نکال کر ڈاکٹر کے نذر کرتے ہیں کہ یہ آپ کا انعام ہے اس موقعہ پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا کہ اگر اس مریض کو ڈاکٹر کے فعل سے ناگواری تھی تو پچاس روپے کیسے دیئے اگر راضی

(۱) تمبا کو کی ایک پتی کھاتے ہی سارے جسم پر دا پھڑ پڑ جائیں گے (۲) خوشی وغم جمع ہو سکتے ہیں۔

تھا تو چیخ کیسے نکلی۔ یہاں ہر شخص عاقل بن جاتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ نشتر کی خاصیت ہے کہ چیخ نکلے رونا آجائے اس لیے یہ فعل عدم رضا کی دلیل نہیں۔ طبعاً الم تھا(۱) اس وجہ سے چیخ ماری۔ اور عقلاً اس فعل پر راضی تھا اس لیے خوش ہوکر انعام دیا۔ بلکہ وہ دراصل طبعاً بھی راضی تھا صرف اتنی بات تھی کہ طبیعت اس وقت نشتر کی خاصیت سے مغلوب ہوگئی تھی جو کہ اب بعد میں غالب آئی ہے اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رضا والم(۲) محبت اور صورت غم دونوں جمع ہوسکتے ہیں پس خوب سمجھ لیجئے کہ محبت ایسی ہی چیز ہے جو تلغ کو شیریں کر دیتی ہے۔ تو یہ دعویٰ ثابت رہا کہ بلاؤں سے نہ بُعد ہوتا ہے اور نہ حجاب بلکہ بلاؤں سے تو اور حجاب اٹھ جاتا ہے حجاب کی چیز تو صرف ایک ہے جو حظ نفس کی ایک فرد ہے اور وہ گناہ ہے اور یہ گناہ وہ چیز ہے کہ بعض مرتبہ اس کے اثر سے ذکر تک سے محرومی ہوجاتی ہے بلکہ بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

## حجاب کے سات درجات

چنانچہ صوفیہ نے حجاب کے سات درجہ بیان کئے ہیں۔ اوّل اعراض، دوسرے حجاب، تیسرے تفاصل، چوتھے سلب مزید، پانچویں سلب قدیم، چھٹے تسلی، ساتویں عداوت یعنی اول اعراض ہوتا ہے اگر معذرت اور توبہ نہ کی حجاب ہوگیا اگر اس کے بعد بھی اصرار رہا تفاصل ہوگیا۔ اگر اب بھی استغفار نہ کیا تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق وشوق کی تھی وہ سلب ہوگئی یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بیہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت وحلاوت کیفیات زائدہ سے پہلے اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہوگئی اس کو سلب قدیم کہتے ہیں اگر پھر بھی توبہ میں تقصیر(۱) کی تو جدائی کو دل گوارا کرنے لگا یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ بغض وعداوت(۲) ہوگئی یہ آخری حجاب ہے جو سب سے اشد ہے(۳) وہاں پہنچ کر بندہ کو حق جل شانہٗ سے بغض(۴) پیدا ہوجاتا ہے اور کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب دوطرف سے آپس میں تکدر ہوجاتا ہے تو یہی سات حالتیں یکے بعد دیگرے وہاں

(۱) طبعی درد تھا (۲) خوشی وغم محبت اور صورت غم (۱) کوتاہی (۲) محبت نفرت ودشمنی میں تبدیل ہوجاتی ہے (۳) سخت (۴) نفرت۔

بھی پیش آتی ہیں۔ایک بزرگ فرماتے ہیں ۔

احب مناجات الحبیب باوجہٍ ولکن لسان المذنبیین کلیل

کہ ہم گنہگاروں کی زبان جو ہے وہ درماندہ ہے کہ اٹھانے سے اٹھتی ہی نہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ انسان جس سے شرمندہ ہوتا ہے اس کے سامنے اتنے کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ میرا قصور معاف کردو۔ یہ ہے تو ایک حال لیکن اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کرلیا گیا تو سخت مضر ہے ایک عذاب ہے وبال ہے۔ خیر یہ بزرگ تو صاحب حال تھے اور اس کے مقتضی پر عمل سے بچے ہوئے تھے۔ مگر بعض لوگ تو اس حال کے مستقضی پر عمل بھی کرتے ہیں۔

## محققین کے علوم انبیاء علیہم السلام کے علوم کے مشابہ ہوتے ہیں

ابن القیم نے الدواء الکافی میں حکایتیں لکھی ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ جب اس کا آخری وقت ہوا تو اس سے توبہ کے لیے کہا گیا تو کہنے لگا کہ اتنے گناہوں میں توبہ کیا کام دے گی۔ اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مرگیا یہ حقیقت میں جہل ہے۔ محققین نے اسی کو ایک مثال سے بالکل سمجھا دیا ہے۔ محققین کے علوم بھی انبیاء علیہم السلام کے علوم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کا یہ طرز ہے کہ وہ معقولات کو محسوسات بنا کر بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح ان محققین کی بھی وہی شان (بفضلہٖ تعالیٰ اس شان کا ظہور جیسا کہ اس وعظ میں متعدد جگہ ہوا ہے اسی طرح شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کی دیگر تقریروں اور تصانیف میں سینکڑوں اور ہزاروں جگہ ہوا جس کا جی چاہے مشاہدہ کرلے ۱۲۔ حمید حسن دیوبندی) ہوتی ہے تو ایک بزرگ ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے میں کسی گناہ کی وجہ سے دیر نہ کرنا چاہیئے تمہاری ایسی مثال ہے جیسے ایک گندا ناپاک شخص دریا کے پاس گیا تو دریا نے کہا تو میرے پاس آ پاک ہوجائے گا اس نے جواب دیا کہ تو پاک اور صاف وشفاف اور میں پلید وناپاک تیرے پاس ایسی حالت میں کیونکر آؤں۔ دریا نے کہا اچھا مت آ مگر بچہ جی ساری عمر یوں ہی ناپاک رہو گے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی چیز پانی کے سوا نہیں جو ناپاک کو پاک کردے اگر ناپاک آدمی پاک

ہونا چاہیے تو اس کو چاہیئے کہ اسی ناپاکی اور گندگی کی حالت ہی میں دریا کے اندر چلا جائے۔ محققین فرماتے ہیں کہ خواہ تم کیسے ہی گنہگار ہو اور اپنے گناہوں سے تم کتنے ہی شرمندہ ہو مگر تم اسی حالت میں اللہ کے دربار میں جا کھڑے ہو اور آنکھیں بند کر کے یہ کہنا شروع کر دو کہ اے اللہ توبہ ہے اے اللہ توبہ ہے اور اس قدر کہو کہ وہ حجاب جو تمہارے اور حق تعالیٰ کے درمیان واقع ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اٹھ جائے یہی حجاب وہ چیز ہے جو توبہ کی توفیق حاصل کرنے کا طریقہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک دفعہ ہمت کر کے زبان سے توبہ شروع کر دو اور کرتے رہو یہاں تک کہ دل سے توبہ نکلنے لگے۔

صاحبو! اس وقت کو غنیمت سمجھو کہ زبان سے توبہ کا لفظ نکالنے پر تم کو قدرت حاصل ہے کبھی یہ بھی سلب نہ ہو جائے۔

## گناہ ایک عظیم بلا ہے

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دن وہ ذکر کرنے بیٹھے اور انہوں نے زبان سے اللہ کا نام نکالنا چاہا تو نہ نکلا بہت حیران ہوئے کہ کیا بات ہے اور باتیں تو زبان سے نکلتی ہیں، مگر اللہ کا نام زبان سے نہیں نکلتا۔ آخر جب مجبور ہو گئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سجدے میں گر کر دل سے دعا کرنے لگے اور بہت گڑگڑائے کہ اے اللہ یہ کیا قہر نازل[1] ہوا الہام ہوا کہ فلاں دن ہنسی میں ایک کلمہ تمہاری زبان سے ایسا نکلا تھا کہ جس میں دین کا استخفاف تھا۔ آج اس کی یہ سزا دی گئی ہے کہ تم کو ہمارا نام لینے کی توفیق نہیں ہوئی کیونکہ تم نے اس کلمہ سے توبہ نہ کی تھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان بند کر دی جاتی ہے اس وقت سنبھلنا ہر ایک کا کام نہیں، یہ خاص لوگوں کا کام ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے تو ہم کو زبانی توبہ کی قدر کرنی چاہیئے مگر ایک بار دو بار پر تو کفایت نہ کرنا چاہیئے بلکہ اتنی کثرت کی جائے کہ دل سے توبہ نکلنے لگے۔

اس حکایت سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گناہ کتنی بڑی بلا ہے کہ ذکر سے بھی محروم کر دیتا ہے اور اگر کسی کو ایسا ہی اتفاق ہو جائے تو وہی کرے جو ان بزرگ نے کیا بہرحال توبہ کرنے سے پھر گناہ کا یہ اثر نہیں رہتا وہ تو بڑے غفور رحیم ہیں چنانچہ ارشاد

(۱) کیا عذاب نازل ہوا۔

فرماتے ہیں: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۱) اور یہاں شکر سے مراد عمل ہے ای عملتم صالحًا۔ مثلاً توبہ ہی ہے کہ یہ بھی عمل صالح ہے تو ان کو تم سے ضد تھوڑا ہی ہے کہ تم توبہ کر رہے ہو اور وہ پھر بھی تم کو عذاب دیں۔ غرض جتنے حجابات ہیں وہ سب اوپر ہی سے ہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں ؎

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم بے پردہ ورنہ ما ہے چوں آفتاب دارم

یعنی حجابات جو ہیں وہ ہماری آنکھ پر ہیں۔ جنہوں نے ہمارے ادراک کو روک دیا ہے محبوب پر کوئی حجاب تھوڑا ہی ہے۔ بھلا اُنہیں کون چیز روک سکتی ہے، البتہ ہمارے ادراک کو بعض چیزیں روکنے والی ہیں۔ اب دیکھئے نا اگر آپ آفتاب کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیں جس سے آفتاب نظر نہ آئے تو یہ حجاب آفتاب پر ہوا؟ نہیں بلکہ آپ کی آنکھ پر ہوا آفتاب کو وہ چیز محجوب کر سکتی ہے جو آفتاب سے بھی بڑی ہو پس حق تعالیٰ کو محجوب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ؎

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم بے پردہ ورنہ ما ہے چوں آفتاب دارم

تو جتنے حجاب ہیں وہ سب بندہ ہی کی طرف سے ہیں ورنہ اس طرف سے رحمت میں کوئی کمی نہیں مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (۲) تو اب بندہ کو چاہیئے کہ فوراً ہر حجاب کو رفع کرے۔ اب رہی یہ بات کہ کیونکر رفع کرے؟ تو اس کے لیے جو طریقے ہیں (یعنی حجابات کے) رفع کرنے کے ان حضرات سے پوچھ کر ان کو اختیار کرے۔ پھر ان شاء اللہ تعالیٰ سب حجابات آسانی سے مرتفع ہو جائیں گے اہل طریق کو بھی یہ بلائیں بہت پیش آتی ہیں بلکہ ان کو دوسروں سے زیادہ خطرناک حالتیں پیش آتی ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں انتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر (۳)

## کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا کفر کے قریب ہے

اہل طریق سے طریق کے دھوکہ میں بعض ایسی دقیق غلطی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر

(۱) ''اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ اللہ بڑے قدر کرنے والے اور جاننے والے ہیں'' سورۃ النساء: ۱۴۷ (۲) ''اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑے قدردان اور جاننے والے ہیں'' (۳) ''تم گناہوں سے ڈرتے ہو اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں''

تک پہنچتی ہے۔ ایک صاحب مجھ کو سفر میں ملے کہنے لگے کہ صاحب اگر کبھی نفس میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور تقاضا کے روکنے سے اس میں اور زیادتی ہو تو ایسی صورت میں اگر ایک بار اس معصیت کا ارتکاب کرلیا جائے تاکہ قلب فارغ ہوجائے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل میں لگ سکے تو اس میں کیا مضائقہ ہے کیونکہ جب تک وہ تقاضا قلب میں رہے گا اس وقت تک قلب ادھر ہی مشغول رہے گا۔ اور جب تقاضا جاتا رہے گا تو پھر آئندہ معصیت کا بھی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس وقت اس معصیت سے استغفار کرلے۔ میں نے کہا توبہ کرو تم قریب بکفر ہو، معاصی میں حکمتیں بیان کرتے ہو۔ اگر کوئی کہے کہ معصیت بھی ایک واقعہ ہے اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہر فعل کے اندر دو مرتبے ہوتے ہیں، خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ایک مرتبہ خلق کا(۱) ایک کسب کا(۲) تو خلق معصیت میں حکمت بیان کرنا تو فعل حق میں حکمت بیان کرنا ہے یہ تو محمود ہے باقی کسب معصیت(۳) میں حکمت بیان کرنا تو یہ قریب بکفر ہے(۴)۔ اور درحقیقت یہ بھی شیطان کا ایک دھوکہ ہے کہ گناہ کرلینے سے تقاضا کم ہوجائے گا کیونکہ ارتکاب معصیت سے فی الحال کچھ دیر کو تقاضا کم ہوجائے گا مگر اس کا یہ اثر ہوگا کہ آئندہ کے لیے مادہ معصیت قوی ہوجائے گا اور جڑ پکڑ جائے گا۔ پھر اس کا ازالہ قدرت سے باہر ہوجائے گا کیونکہ انسان جب تک کوئی گناہ نہیں کرتا اس وقت تک گناہ اس کی نظر میں پہاڑ کی طرح بھاری اور خطرناک ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ کرلیا اب ایسا خطرناک نہیں دکھلائی دیتا ہے معمولی بات ہوجاتی ہے۔ ایک دفعہ ارتکاب کے بعد پھر بچنا آسان نہیں۔ اسی کو شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے ؎

شکم صوفئے رازبوں کر دو فرج ۔۔۔ دو دینار بر ہر دو آں کرد خرج
یکے گفتش از دوستاں در نہفت ۔۔۔ چہ کردی بدیں ہر دو دینار گفت
بدینارے از پشت راندم نشاط ۔۔۔ بدیگر شکم را کشیدم سماط
فرو مائیگی کردم وابلہی ۔۔۔ کہ ایں ہمچناں پر شدد اں تہی (۵)

(۱) پیدا کرنا (۲) اختیار کرنے کا (۳) گناہ اختیار کرنے میں (۴) کفر کے قریب ہے (۵) ''صوفی کے شکم اور فرج نے خراب کردیا دونوں دیناران دو پر خرچ کردیئے دوستوں میں سے ایک نے اس سے چھپ کر کہا کہ تم نے دونوں دینار کا کیا کیا تو اس نے کہا کہ ایک دینار میں نے خوشی پر خرچ کیا اور دوسرے سے پیٹ کو موٹا کیا۔ میں نے گھٹیا کام کیا کہ یہ اس سے پُر کیا اور وہ خالی ہے''۔

یعنی جس چیز کو بھر لیا تھا۔ یعنی شکم کو وہ تو پھر خالی ہوگئی اور جس کو خالی کیا تھا۔ یعنی شرمگاہ کو وہ پھر بھر گئی دونوں فعل بے نتیجہ ہوئے۔ اور بالفرض اگر تقاضا نہ بھی رہا تو پھر اس پر خوش نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تقاضا جاتا رہنا مسبب ہے، گناہ (۱) (یہ تحقیق آپ زر سے لکھنے کی ہے، فلله دره ثم الله دره ۱۲) سے اور تقاضا کا باقی رہنا، مسبب تھا طاعات سے (۲) اس لیے میں جزم کے ساتھ کہوں گا کہ طاعات کے ساتھ تقاضائے معصیت (۳) موجب قرب ہے اور معصیت کے ساتھ عدم تقاضا موجب قرب نہیں ہوسکتا ارتکاب سے پہلے جو اس تقاضے کی وہ مخالفت کررہا تھا یہ مقاومت نفس اور مجاہدہ (۴) کی ایک فرد تھی جو موجب قرب ہے۔

## موافقت سنت عنداللہ محبوب ہے

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں جب تک روح نہ ہو خالی اٹھک بیٹھک کرنے سے کیا فائدہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ اس اٹھک بیٹھک کی قدر وہاں پہنچ کر معلوم ہوگی اور ترک نماز تو بڑی سخت چیز ہے اگر اس کی کوئی سنت بھی ترک ہوجائے تو نماز کا نور کم ہوجاتا ہے۔ گو باطنی ادب محفوظ ہے اور ادائے سنت کے ساتھ اگر باطنی کمی ہوجائے تب بھی نور میں اتنی کمی نہیں ہوتی مثلاً اگر ہم مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں تو گو اس میں ہم کو ہزاروں وساوس آئیں مگر وہ زیادہ قیمتی ہوگی۔ اس یکسوئی سے جو بلا جماعت کی نماز میں ہم کو حاصل ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ایک بزرگ تھے۔ مولوی محبت الدین صاحبؒ بڑے صاحب کشف تھے انہوں نے ایک بار ارادہ کیا کہ ایک دفعہ دو رکعتیں ایسی پڑھیں جن میں کوئی وسوسہ نہ آئے۔ چنانچہ وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھی جس میں تمام ظاہری و باطنی شرائط کا لحاظ رکھا اور شروع سے آخر تک کوئی وسوسہ نہ آیا پوری طرح کامیاب ہوگئے جب نماز سے فارغ ہوئے تو عالم مثال کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھے کہ دیکھوں اس کی وہاں کیا صورت ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک نوجوان پری پیکر حور کھڑی

(۱) تقاضے کے ختم ہونے کا سبب گناہ کا ارتکاب ہے (۲) تقاضے کے باقی رہنے کا سبب طاعت ہے (۳) نیکی کرتے وقت گناہ کا تقاضا ہونا باعث قرب ہے کیونکہ اسی تقاضے پر عمل نہیں کیا (۴) ارتکاب گناہ سے قبل جو اس تقاضے کو دبا رہا تھا اور اس کی مقتضاء پر عمل نہیں کررہا تھا وہ نفس سے مقابلہ کرکے مجاہدے کا ثواب حاصل کررہا تھا۔

ہے جو حُسن میں لاثانی، سر سے پیر تک زیورات سے مرصع ہے ہَر ہَر عضو خوبصورت ہے مگر آنکھوں سے اندھی ہے۔ یعنی آنکھیں تو موجود ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں مگر روشنی نہیں۔ انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ سے اس کا مجملاً تذکرہ کیا۔ حضرت نے فی البدیہ فرمایا کہ شاید آپ نے یکسوئی کے لیے آنکھیں بند کرلی ہوں گی۔ کہا جی ہاں فرمایا کہ بس اتنی ہی کمی رہی۔ اگر نماز سنت کے موافق ہو تو گو اس میں لاکھوں وساوس آئیں وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس سے جو مسنون طریقہ کے خلاف پڑھی جائے کیونکہ پہلی نماز اوفق بالسنة (سنت کے مطابق) ہوگی اور یہ ابعد عن السنة (سنت سے بعید) ہے پہلی صورت میں گو حسن اور زیورات میں کمی ہوتی مگر آنکھوں سے تو اندھی نہ ہوتی۔ دوسری صورت میں حسن زیادہ حاصل ہوا مگر اندھی رہی اور ظاہر ہے کہ اندھی عورت سے گو کیسی ہی حسین ہو سوانی(۱) عورت افضل ہے گو حسن زیادہ نہ ہو پس خوب سمجھ لو کہ بندہ کی ساری عمر اگر اسی کشتم کشتہ میں گزر جائے اور مقاومت (مقابلہ) نفس میں مشغول رہے اور تقاضائے معاصی اس کو پریشان کرتے رہیں یکسوئی بھی حاصل نہ ہو تو یہ موجب قرب ہے کیونکہ یہ عمل ہے اور گناہ کے تقاضے پر عمل کر لینے کے بعد جو ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے وہ ہرگز قابلِ قدر نہیں کیونکہ وہ کیفیت ہے عمل نہیں اور کیفیت موجب قرب نہیں ہے پس گناہ سے بچنا بہت ضروری ہے۔

## فوراً توبہ کی ضرورت

اور جو مبتلا ہو گیا ہو اس کو ہمت کے ساتھ جلد توبہ کرنا چاہیئے۔ گناہ کے بعد اگر بند ہا اس وجہ سے توبہ نہ کرے کہ میرے گناہ اس درجہ ہیں کہ توبہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ بھی حماقت اور شیطان کا جال ہے اور حقیقت میں یہ کبر ہے کہ اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا کچھ ایسا نقصان کر دیا ہے کہ اب وہ اس کو معاف نہیں کر سکتے کیا اللہ میاں سے بھی مساوات کا دعویٰ ہے۔ یاد رکھو یہ برتاؤ تو بالکل برابر کا سا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ اور اس کی صفات کاملہ کے سامنے تمہاری اور تمہارے افعال کی ہستی ہی کیا ہے؟ سارا عالَم بھی نافرمان بن جائے تو ان کا ذرہ برابر کچھ نقصان نہیں ہو سکتا نہ ان کو عفو و کرم سے کوئی امر مانع ہو سکتا ہے۔

(۱) برصغیر پاک و ہند کے شوالک پہاڑوں کی ایک ثقافت ہے۔ اس ثقافت کا نام وادی سواں کے بعد پڑا۔

## اپنے گناہوں کو بہت زیادہ سمجھنا تکبر ہے

مشہور ہے کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر جا بیٹھا تھا جب وہاں سے اڑنے لگا تو بیل سے معذرت چاہی کہ معاف کیجئے گا آپ کو میرے بیٹھنے سے بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ بیل نے کہا ارے بھائی مجھ کو تو خبر بھی نہیں کہ تو کب بیٹھا تھا اور کب اڑا تو جیسے وہ مچھر سمجھا تھا کہ مجھ میں اتنا وزن ہے کہ جس سے بیل بھی دب گیا ہوگا۔ اسی طرح یہ شخص بھی اپنے گناہوں کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ جس سے اس بات کا اندیشہ ہوگیا کہ حق تعالیٰ میرے ان گناہوں سے متاثر ہوگئے ہوں گے۔ حالانکہ حق تعالیٰ پر کسی چیز کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تو اپنے گناہوں کو اتنا بڑا سمجھنا کہ توبہ کافی نہ ہو یہ درحقیقت تکبر ہے گو صورۃً شرمندگی ہے۔

پھر صاحب ہمارا تو نصوص پر ایمان ہے۔ نصوص میں یہ کہیں نہیں وارد ہوا کہ فلاں گناہ میں توبہ نہیں۔ سب سے بڑا گناہ کفر ہے مگر توبہ اس کے لیے بھی ہے۔ ابوجہل تک کو بھی توبہ کا حکم ہے اگرچہ اس کے متعلق خبر دے دی گئی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا مگر پھر بھی حکم ہے کہ توبہ کر۔ تو حضرت اس سے بڑھ کر کس کا کفر شدید ہوگا۔ اور اس کا کفر ظاہراً ممتنع (یہ علم بھی عجیب وغریب ہے جس کی علماء ظاہر کو غالباً ہوا بھی نہیں لگی ۱۲) الزوال بھی تھا کیونکہ نص کے اندر خبر دے دی گئی تھی مگر اس کو بھی حکم ہے کہ امن وتب الیہ۔

## انقباض بھی گناہ کا اثر ہے

تو اگرچہ صوفی کی یہ شرمندگی جس کی وجہ سے اس کی زبان نہیں اٹھتی بوجہ افتقار وانکسار (محتاج ہونا) کے ہے لیکن اس کو حکم ہے کہ توبہ کرو۔ لہٰذا اس پر توبہ واجب ہے مگر چونکہ اس میں ایک قسم کا جہل بھی ہے اس لیے توبہ کرنے میں اس کو انقباض (بھیج جانا) ہے اور دل رُکتا ہے اور یہ انقباض بھی گناہ کا اثر ہے اس کے اندر ایک ساتھ دو کیفیتیں جمع ہوجاتی ہیں ایک تو عزم توبہ اور ایک توبہ سے رکاوٹ ایسے ہی مواقع پر پہنچ کر کوئی ناقص چیخ اٹھتا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندہ کردہ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش (۱)

یہ دراصل عربی کے اس شعر کا ترجمہ ہے۔

(۱) ”دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو خبردار دامن تر نہ ہو“

القاه فی الیم مکتوفاً وقال له ایّاك ایّاك ان تبتل بالماء(۱)

وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہاں جمع بین الضدین(۲) کا حکم کیا گیا ہے اس جہل میں مبتلا ہوجاتا ہے مگر یہ پورا جہل ہے۔ خدا کی قسم بالکل باطل ہے غلط ہے اور یہ اول تو کسی جاہل کا قول ہے۔ اور اگر کسی صاحبِ حال کا ہے تو اس وقت اس پر جہل غالب تھا اس لیے کہ کوئی اس سے پوچھے کہ انقباض زبان پر ہے یا نفس پر تو اس سے (کلام سے) کہ لسان کو کلیل کہا، ظاہر یہ ہے کہ زبان پر ہے تو تم یہ تو کرسکتے ہو کہ ہاتھ پھیلا کر دل سے توبہ کرنے لگو یا سجدہ میں گر کر رونے لگو یا رونے کی صورت بنالو اور دل سے توبہ کرلو۔ اور اگر نفس پر ہے کہ دل بوجہ غلبۂ جہل کے توبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو زبان پر قدرت موجود ہے۔ اگر اس کو چلاؤ گے تو وہ ضرور چلے گی جب زبان پر قدرت ہے تو زبان سے توبہ کرسکتے ہو دل سے توبہ نہیں نکلتی تو زبان ہی چلاؤ مگر تم نے تو ہمت ہی ہار دی اور خواہ مخواہ اپنے کو مجبور اور توبہ کو دشوار سمجھ لیا۔

## حالتِ انقباض میں توبہ کا حکم

بفرض محال اگر کسی کو زبان پر بھی قدرت نہ رہے کہ زبان ہلانا چاہتا ہے مگر چلتی نہیں تو چلانے کا قصد ہی کرے کہ یہ عزم بھی بجائے چلانے کے ہے۔ بس اگر تم نے زبان ہلانے کا عزم کرلیا خواہ وہ نہ چلے تو توبہ ہوگئی اگر اب بھی انقباض باقی رہے تو پھر اسی طرح توبہ کرو اگر پھر بھی انقباض(۳) باقی رہے تو پھر توبہ کرو اسی طرح چار پانچ بار کرنے سے وہ انقباض رفع ہوجائے گا(۴) صاحبو یہاں ملفوظات کے یاد کرنے سے کام نہیں چلتا بلکہ معالجات کو یاد کرنا چاہیئے۔ یہ سب شیطان کے فریب ہیں وہ ایسی باتوں سے لوگوں کو اعمال سے باز رکھنا چاہتا ہے غرض باطن کو کتنا ہی ضرر گناہوں سے پہنچا ہو توبہ سے اس کا علاج کرو۔ اگر کہو کہ صاحب توبہ کے بعد بھی اندیشہ ہے کہ پھر گناہ ہوجائے گا۔ کہاں تک توبہ کریں تو میں کہتا ہوں کیا علاج کرانے کے بعد تم پھر کبھی بیمار نہیں پڑتے اور کیا ایک بار علاج کرانے کے بعد پھر علاج نہیں کراتے بھادوں(۵) کی فصل میں بخار جاڑہ آتا ہے تو تم علاج کراتے ہو اور اگر کوئی کہے کہ بھائی کیوں علاج کراتے

(۱) ''اس کو دریا میں باندھ کر ڈال دیا ہے اور کہتا ہے دیکھئے پانی میں نہ بھیگنا'' (۲) دو متضاد چیزوں کے جمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۳) توبہ سے رکاوٹ ہوتی ہو (۴) وہ رکاوٹ دور ہوجائیگی (۵) پنجابی، بنگالی اور بکرمی کیلنڈر شمسی کا پانچواں مہینہ ہے جو وسط اگست سے شروع ہوکر وسط ستمبر پہ ختم ہوتا ہے۔

ہو پھر بھادوں آنے والا ہے تو کیا تم علاج سے رک جاؤ گے یہ جواب دو گے کہ اگر بھادوں آئے گا تو آنے دو اگر بیمار پڑیں گے پھر علاج کرالیں گے اسی طرح یہاں کہا جاتا ہے کہ اگر پھر گناہ ہوجائے پھر توبہ کرلیجئے توبہ کرنے میں پھاوڑے تو چلانے نہیں پڑتے۔ اگر کہو صاحب یہ توبہ کیا ہوئی ایک کھیل ہوگیا تو صاحب کھیل ہی سہی مگر یہ وہ کھیل ہے جسے کہا کرتے ہیں کہ کھیلتے ہی کھیلتے گھر بس جائے گا۔ توبہ حقیقی نہ سہی تشبہ تو ہے تائبین کے ساتھ۔

## ساحرین کے ایمان لانے کا سبب

آپ نے سنا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت ایمان دی مگر وہ ایمان نہ لایا اور وہ ساحر جو موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے کے لیے آئے تھے مشرف باایمان ہوگئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری سے اس کی وجہ دریافت کرنا چاہی ارشاد ہوا کہ ساحر تمہاری وضع بنا کر آئے تھے، لہٰذا ہم نے نہ چاہا کہ جو ہمارے محبوب کی شکل اختیار کرے اس کو محروم چھوڑ دیں اور محبوب نہ بنائیں۔

## ایک نظر میں کامل کردینے کا مفہوم

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اپنے شیخ کے ہمراہ تشریف لئے جارہے تھے راستہ میں ویرانہ میں ایک مسجد ملی وہاں چند مکار مراقب بنے بیٹھے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو توجہ دے رہے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اے مرزا اگر تم نے مکاروں کو نہ دیکھا ہو تو ان کو دیکھ لو۔ خیر بات ختم ہوئی تھوڑی دیر کے بعد مرزا صاحب کو اتفاقاً پھر پکارا وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ جب تشریف لائے تو شیخ نے فرمایا کہاں گئے تھے کہا حضرت آپ کے ارشاد کے بعد مجھ کو خیال ہوا کہ ان پر حضرت کی نظر تو پڑ ہی گئی ہے میں نے گوارا نہ کیا کہ جس پر حضرت کی نظر پڑے وہ محروم رہے لہٰذا میں ان کے قلب میں القائے نسبت کررہا تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے سب کو ایک نظر میں کامل کردیا۔ اب یہاں ایک شبہ ہوسکتا ہے کہ ایک نظر میں کامل کیسے ہوگئے تو یہ غور کرنے کی بات ہے۔ ایک نظر میں کامل کردینے کے یہ معنی ہیں کہ استعداد کمال کی پیدا ہوگئی یوں شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ ایک نظر میں کمال حاصل ہوجائے جب پہلے سے استعداد ہو اسی واسطے کہا گیا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی (۱)

## متشبہ صوفی بھی قابلِ قدر ہے

تو جناب زبان تو آپ کے قابو میں ہے اس کو چلایئے اس لیے کہ اہل تشبہ پر بھی نظر ہوجاتی ہے من تشبہ بقوم فھو منھم (۲) اہل حق کے لیے بھی عام ہے بدلیل قولہ صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب (۳) بزرگوں نے لکھا ہے کہ صوفی قابل قدر ہے ہی متشبہ بالصوفی (۴) بھی قابل قدر ہے گوریا کی نیت سے صوفیوں کی شکل بنانا فی نفسہ محمود نہیں (۵)، مگر اس تشبہ سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس کے دل میں عظمت ہے اہل اللہ کی ورنہ کوئی شخص بھنگی کی شکل نہ بنالے؟ تو حضرت اس عظمت پر بھی فضل ہوجاتا ہے۔ وہاں تو فضل وکرم کے لیے بہانا ڈھونڈھتے ہیں یہی معنی ہیں، مولانا رومی کے اس شعر کے ؎

بانگ می آید کہ اے طالب بیا جود محتاج گدایاں چوں گدا (۶)

گو اس کو اگر حضرت الٰہیہ کے معاملہ کے متعلق کہا جائے جیسا مولانا کی عادت ہے کہ مجازی پردہ میں حقیقت کو بیان کرتے ہیں اس صورت میں الفاظ ذرا تیز ہوگئے ہیں مگر اسی مضمون کو حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے الفاظ میں ادا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد مابا ومحتاج بو دیم او بما مشتاق بود (۷)

پس حافظ صاحب نے حقیقت کو استعمال فرمایا ہے اور مولانا نے مجاز کو استعمال فرمایا ہے۔ لازم بول کر ملزوم مراد لے لیا ہے۔ مطلب مولانا کا یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی طلب کرے اور ڈھونڈتا ہوا آئے فرماتے ہیں ؎

(۱) ''پلک جھپکنے کے برابر اس شہنشاہ حقیقی سے غافل مت ہو، شاید اس کی نگاہ لطف تجھ پر پڑتی ہو اور مجھ کو خبر نہ ہو'' (۲) ''جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی پس وہ اُنہی میں سے ہے'' سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱، مسند احمد: ۲/۵۰ (۳) ''انسان قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے'' الصحیح للبخاری: ۸/۴۸، سنن الترمذی: ۲۳۸۶ (۴) جس نے بتکلف صوفیاء کی سی صورت بنائی ہو (۵) اپنی ذات میں پسندیدہ نہیں (۶) '' آواز آئی کہ اے طالب آؤ، سخاوت بھی فقیروں کی مانند فقیروں کی محتاج ہے'' (۷) ''اشتیاق بمعنی محبت صفت کمال ہے بخلاف احتیاج کے۔ مگر مراد اس سے بھی مجازاً اشتیاق ہی ہے''

آبِ کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آیت از بالاؤ پست

کیونکہ ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں(۱)

آگے اس کی شرح فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدش معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم این وہم آں(۲)

مگر فرق یہ ہے کہ ؎

عشق معشوقاں نہان است وستیر عشق عاشق باد وصد طبل ونفیر

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش وفربہ کند(۳)

یعنی وہاں اور آثار ہیں محبت کے اور یہاں اور مگر محبت وہاں بھی ہے اس لیے کہ ؎

اگر از جانب معشوق نہ باشد کششے طلب عاشق بیجا رہ بجائے نرسد

## مغفرت کی خاصیت بارود کی مانند ہے

اور جب یہ ہے کہ ان کو بھی تم سے محبت ہے تو پھر تو ذرا بہانہ چاہیئے رحمت کے لیے مگر یہ آثار اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب ادھر سے بھی طلب ہو یعنی تم بھی ارادہ کرو۔ ورنہ ارشاد ہے کہ اَنُلۡزِمُکُمُوۡھَا وَاَنۡتُمۡ لَھَا کٰرِھُوۡنَ(۴) ان کے اندر استغنا بھی ہے۔ اور معشوقوں میں ہوتا ہی ہے اور وہ تو استغنا سے کام بھی نہیں لیتے مگر تمہاری بے رخی اور اعراض علاج کرنے کی مصلحت سے کبھی کبھی کھڑکھڑا بھی دیتے ہیں جیسے کوئی معشوق اپنے عاشق کے پاس آیا۔ دیکھا تو عاشق پڑا سو رہا ہے اس نے ایک ٹھوکر مار کر جگا دیا یہ تو شان استغنا ہے مگر یہاں یہ ہے کہ معشوق نے رحم کھا کر اٹھا دیا اور ملامت کر کے اس کی بغل میں بیٹھ گئے یہ تو بہت ہی عجیب ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بیچارہ

(۱) ''پیاسے تو پانی ڈھونڈتے ہی ہیں پانی بھی خود ان کی طلب میں ہے کہ پیاسے کہاں ہیں پیاسے کہاں ہیں''
(۲) ''جو عاشق کو دیکھے گا معشوق کو پہچان جائے گا کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہیں''
(۳) معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے اور عاشق کا عشق کو ڈھول اور آواز کے ساتھ ہے لیکن عاشق کا عشق اس کے بدن کے ٹکڑے کرتا ہے جب کہ معشوقوں کا عشق خوش اور موٹا کرتا ہے'' (۴) ''کیا ہم تمہیں (اپنی رحمت) چپکا دیں گے جبکہ تم اس سے نفرت کرتے ہو'' سورہ ھود: ۲۸

معذور ہے انسان کو نیند سے چارہ نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو تہجد کے عادی ہیں وقت پر جگا کر اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کا شرف دے دیتے ہیں اور یہ شان تو انہیں کی ہے کہ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۱) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخیر شب میں آسمان اول پر نزول فرماتے ہیں اور یہ ندا دی جاتی ہے کوئی طالب مغفرت ہے کہ میں اس کی مغفرت کردوں، کوئی طالب رزق ہے کہ اس کو رزق دے دوں۔ اس وقت بہت لوگ غافل پڑے سوتے ہیں اس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بانگ می آید کہ اے طالب بیا جود محتاج گدایاں چوں گدا (۲)

جب یہ بات ہے تو کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ وہ توبہ قبول نہ کریں گے بھلا ان کے متعلق یہ گمان کیسے ہوسکتا ہے۔ اس جہل کو نکالو اور توبہ سے مت رکو کہ صاحب ہمارے تو گناہ بہت بڑے ہیں، ارے صاحب تمہارے گناہ تو کیا بڑے ہوتے تم ہی کہاں کے بڑے ہو وہ گناہ تو تمہاری صفت ہے جب موصوف ہی بڑا نہیں تو صفت کیسے بڑی ہوجائے گی، بخلاف ان کے کہ ان کا ہر فعل چھوٹے سے چھوٹا بھی بڑا ہے یہی معنی ہیں اس کے جو حدیث میں آیا ہے کہ اگر ساری زمین گناہوں سے بھر جائے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے۔ دیکھئے بارود ذرا سی ہوتی ہے مگر بڑے بڑے پہاڑوں کو اڑا دیتی ہے بفرض محال اگر مغفرت چھوٹی بھی ہوتی تو اس کی خاصیت بارود کی سی ہے۔ اگر بندوں کو رحمت حق کا مشاہدہ ہونے لگے تو گناہوں کو بڑا سمجھنے پر شرمندگی ہوگی ناامیدی تو کیا ہوتی۔ مگر اس شرمندگی کے مقتضی پر عمل نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ گناہ اگرچہ رحمت کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں مگر تمہارے لیے تو بڑے ہی ہیں۔ تولہ بھر سنکھیا اگرچہ من بھر تریاق کے سامنے چھوٹا ہے مگر معدہ کے مقابلہ میں بڑا ہے تو گو تریاق کے مقابلہ میں سنکھیا اپنا اثر نہیں کرتا مگر بغیر تریاق استعمال کئے تریاق کا اثر کب ظاہر ہوسکتا ہے بس اس تریاق کا استعمال یہی ہے کہ زبان سے کہو اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ (۳) وہ تمہاری مغفرت کے لیے ہر وقت تیار ہیں مگر تم مغفرت تو مانگو اس تریاق کا اثر ظاہر تو کریں گے وہی، مگر تم اس تریاق کا استعمال تو کرو۔ دیکھو اگر وہ تریاق تمہارے سامنے رکھ دیتے اور ترکیب

(۱) ''نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند'' سورۃ البقرۃ: ۲۵۵ (۲) ''آواز آئی کہ اے طالب آسخاوت خود محتاج کی مانند فقیروں کو تلاش کرتی ہے'' (۳) ''اے اللہ مجھے بخش دے اے اللہ مجھے بخش دے''

کھانے کی نہ بتلاتے تو تم کیا کرتے پس کتنی بڑی عنایت ہے کہ زہر گناہ کے لیے تریاق بھی بنایا اور اس کی ترکیب بھی ہم کو بتلادی صرف استعمال کی دیر ہے۔

## حکایت آصف الدّولہ

اس مضمون پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی۔ آصف الدولہ لکھنؤ کے بادشاہ کا وزیر تھا۔ اور بہت سخی تھا عوام میں بطور مثل مشہور تھا کہ یہ ایسا خوش نصیب ہے کہ اگر پتھر سے اس کے گھوڑے کی ٹاپ لگ جائے تو وہ سونا بن جائے۔ ایک بڑی بی نے جو سنا تو ایک پتھر کی سل (۱) لے کر اصطبل میں پہنچیں اور اس کے گھوڑے کے سم سے اس کو ملنے لگیں۔ اتفاق سے آصف الدولہ ادھر آنکلا پوچھا بڑی بی کیا کر رہی ہو۔ بڑی بی نے جو سنا تھا بیان کر دیا۔ آصف الدولہ نے کہا مائی تم نے سچ سنا مگر اس کی ترکیب تم سے نہیں آتی اس کو ہم جانتے ہیں۔ تم اپنی سل یہیں چھوڑ جاؤ کل آکر لے جانا وہ چھوڑ گئی آصف الدولہ نے فوراً حکم دیا کہ ایک ایسی سل اتنی ہی بڑی ٹھوس سونے کی بنائی جائے چنانچہ وہ بن گئی۔ اور بڑی بی بھی پہنچیں تو کہا لو مائی اپنی سل دیکھو اب وہ سونے کی بن گئی ہے دیکھئے اس شخص نے احسان بھی نہ جتلایا اور اس کو مالا مال کر دیا۔

## حق تعالیٰ شانہٗ کی بے انتہا عطا وسخا

کیا خدا کی سخاوت ورحمت آصف الدولہ سے بھی کم ہوجائے گی ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ان کی عطا وسخا کے سامنے کسی کی کیا ہستی ہے جنت کے خزانے جب سامنے آئیں گے آنکھیں کھل جائیں گی جن کے حاصل کرنے کا طریقہ سب کو اللہ تعالیٰ نے بتلادیا ہے۔ غرض وہ جانتے ہیں کہ اس تریاق سے کیونکر علاج ہوسکتا ہے۔ بس اس کا طریقہ یہی ہے کہ اے اللہ ہم کو مغفرت دے دیجئے ان شاء اللہ وہ گناہ بھی بخش دیں گے اور انعام میں جنت کے خزانے بھی دے دیں گے۔ افسوس ہے کہ آپ سے اتنا کام بھی نہیں ہوسکتا۔ ایسے تنگ مزاج ہوگئے (۲)۔ اب اس پر بھی اگر ادھر سے کمی رہے تو بتلایئے کس پر الزام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ گناہ بڑی چیز تھی جو بُعد کا (۳) سبب ہورہی تھی۔ جس کے رفع کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے یہ مضمون ضرورت توبہ کا ذہن میں آیا۔ اسی واسطے اس کتاب میں سے وہ حدیثیں میں نے نکالیں جن

(۱) پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا (۲) ایسا دماغ خراب ہوگیا (۳) دوری کا سبب۔

میں یہ مضمون ہے (یعنی توبہ کا) پھر حاضرین میں سے ایک صاحب سے دریافت فرمایا کہ کیا وقت ہوگیا عرض کیا گیا کہ ابھی تو ایک گھنٹہ ہوا ہے اس پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تو تمہید ہی ہوئی ہے (اصلی مضمون ابھی باقی ہے) تو حضرت نے فرمایا کہ مشہور ہے کہ مور کی دُم مور سے بڑی ہوتی ہے۔ اس پر احقر نے عرض کیا کہ ابھی وہ خود مور بھی تو موجود نہیں ہوا۔ الغرض حاضرین کے اصرار پر حضرت نے کتاب کھول کر ارشاد فرمایا۔

## توبہ سے متعلق دو احادیث

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو حدیثیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک اپنی طرف سے روایت کی ہے مگر یہ ان کا اپنی طرف سے بیان کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہی بیان کی گئی ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کی شان وہ ہے جیسے کسی نے کہا ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم (۱)

تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مثال مومن کی جو ڈرتا ہے اپنے گناہوں سے ایسی ہے جیسے ایک شخص پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں گر نہ پڑے (پھر حضرت حکیم الامت مجدد الملت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا) کہ مجھ کو یاد ہے کہ ایک بار میرا کوئٹہ کا سفر ہوا تھا، وہاں ہم سیر کرتے چلے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک پہاڑ دیکھا جس کا ایک بہت بڑا حصہ آگے کو جھکا ہوا ایک بہت تھوڑی جگہ پر لٹکا ہوا ہے اور صدیوں سے اسی صورت سے موجود ہے تو جب ہم اس کے نیچے پہنچے تو بڑا ہی ڈر معلوم ہوا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا۔ اسی طرح مومن بھی اپنے گناہوں سے ڈرتا ہے۔ گو ادنیٰ ہی گناہ ہو اس سے بھی ڈرتا ہے۔ بخلاف فاجر کے کہ وہ گناہ کو مثل مکھی کے سمجھتا ہے کہ آئی اور اڑا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ کو سخت سمجھ کر توبہ کرنا علامت ہے ایمان کی اور اس کو ہلکا سمجھنا علامت ہے بے ایمانی کی اور اوپر جو آیا ہے کہ گناہ کو بڑا نہ سمجھے اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا نہ سمجھے کہ توبہ سے مانع ہوجائے (۲) اور یہاں بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا نہ سمجھے کہ توبہ کی ضرورت نہ سمجھے غرض اصل چیز توبہ ہے جو اعتقاد توبہ سے مانع ہو وہ مذموم ہے خواہ بڑے ہونے کا اعتقاد خواہ چھوٹا ہونے کا اعتقاد۔

(۱) ''آئینہ کے پس پردہ مجھے بٹھا رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا وہی میں کہتا ہوں'' (۲) توبہ کرنے سے ہی رک جائے

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے یعنی اس کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے سے اتنا خوش ہوتے ہیں جیسا ایک شخص اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کے لیے روانہ ہوا چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جو چٹیل میدان ہے نہ وہاں کوئی چیز کھانے کی نہ پینے کی نہ کوئی درخت ہے جس کے سایہ کے نیچے آدمی قیام کر سکے۔ غرض کہ تمام سامان ہلاکت کے موجود ہیں اور اس کے پاس جو اونٹنی ہے اسی پر تمام سامان کھانے پینے کا لدا ہوا ہے یہ گویا ایک مثال فرض کی ہے حضور ﷺ نے۔ بس وہ شخص اس جنگل میں جا کر اُتر پڑا اور سر رکھ کر سو گیا۔ سوتے سوتے آنکھ کھلی تو اونٹنی ندارد (۱) اب وہ بڑا حیران و پریشان ہوا۔ ہر طرف تلاش کیا مگر کہیں پتا نہ چلا بے سروسامانی سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اپنی زندگی سے بھی ناامید ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مرنا تو ہے ہی پھر پریشانی میں کیوں مروں۔ مرتا بھی سکون ہی کے ساتھ اچھا (پھر حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ) جیسے ایک بخیل کی حکایت مشہور ہے۔ کہ ایک بار وہ بیمار ہو گیا اس کے لڑکے نے کہا اباجان علاج کرائیے! کہنے لگا کہ اگر علاج نہ کرایا تو کیا ہوگا۔ کہا ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کہنے لگا اچھا حساب لگاؤ کہ علاج میں کیا خرچ ہوگا۔ چنانچہ اندازے سے حساب لگا کر بتایا گیا۔ پھر کہا اچھا اس کا بھی حساب کرو کہ اگر ہم علاج نہ کرائیں اور مرجائیں تو مرنے میں کیا خرچ ہوگا بتلایا گیا کہ مرنے میں اتنا خرچ ہوگا جو علاج کے خرچ سے کم تھا، کہنے لگا کہ بس اب ہماری رائے مرنے ہی کی ہوگئی ہے کیونکہ اس میں خرچ کم ہے۔ بخل ہو تو ایسا تو ہو۔ تو اس نے حساب اسی لیے لگایا کہ یکسوئی کے ساتھ مروں۔ خیر میں یہ بیان کر رہا تھا کہ جب وہ شخص ناامید ہو گیا تو اس نے اونٹنی کا تلاش کرنا چھوڑ دیا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا کلائی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں گویا مرنا اختیار میں نہ تھا۔ تو مرنے کی شکل بنانا تو اختیار میں تھا۔ اسی حالت میں وہ سو گیا۔ اب آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی سامنے کھڑی ہے اور سارا سامان جو اس کے اوپر لدا ہوا تھا موجود ہے اب اس کی خوشی کی کچھ انتہا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو زندگی سے مایوس ہو کر مرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ تو دیکھتا ہے کہ خلاف امید اونٹنی کھڑی

(۱) اونٹنی غائب۔

ہے اور اس پر اس کا سامان بھی جوں کا توں رکھا ہوا ہے تو اب وہ کیسا خوش ہوگا آگے حدیث میں اس کے خوشی کے بعض آثار بھی مذکور ہیں جو ابھی آتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جتنا یہ شخص خوش ہوگا اس سے زیادہ اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے۔ بھلا انہیں کیا ضرورت تھی خوش ہونے کی ان کا اس میں کیا نفع تھا۔ مگر وہ اپنے بندہ کو بہت ہی چاہتے ہیں، عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ سے بہت کچھ امید رحمت کی ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی شان نزول پر نظر کر کے کہ نو مسلموں کے باب میں ہے۔ حدیث میں اس سے بھی زیادہ رحمت حق پر دلالت ہے تو گو توبہ سے بندہ کا ہی بھلا ہوتا ہے مگر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مرتبہ اتنا اپنی صحت سے جی خوش نہیں ہوتا جتنا اپنے پیارے کی صحت سے ہوتا ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں کہ تیری بیماری مجھے لگ جائے۔ گو امتحان پر بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں۔ مگر خیر زبان سے تو کہتے ہیں، جو ایک درجہ میں علامت ہے غایت محبت کی جب ہی تو اس کی بھلائی سے اپنا جی خوش ہوا۔ پھر انسان کو اپنی غرض بھی مطلوب رہتی ہے اور اگر کوئی بالکل ہی بے غرض ہو تو کم از کم اپنے پیارے کی راحت سے قلب کو راحت تو ضرور ہوگی یہ بھی ایک غرض ہی ہے کیونکہ انفعال خاصہ بشری ہے(۱) تو انسان کے اندر اس کا بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس نے یہ کام اپنی راحت قلب کی وجہ سے کیا ہوگا۔ لیکن حق تعالیٰ تو انفعال سے بھی پاک ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ  در گراں جانی و چالاکی ہمہ(۲)
من نگردم پاک از تسبیح شان  پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں(۳)

یعنی حق تعالیٰ جل جلالہٗ تو اتنے پاک ہیں کہ تمہاری سمجھی ہوئی پاکی سے بھی پاک ہیں ان کی تو وہ شان ہے کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء(۴) تو انسان کا تو انسان کی بیماری سے دل دکھتا ہے اسی لیے اس کی صحت چاہتا ہے۔ حق تعالیٰ تو اس سے بھی پاک ہیں بس حق تعالیٰ کو جو بندہ سے محبت ہے وہ بالکل بے علت و بے غرض محبت ہے۔ غرض وہ

(۱) فعل سے متأثر ہونا انسانیت کا خاصہ ہے (۲) ''ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں، پاکی سے پاک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اس سے پاک ہیں'' (۳) ''یعنی لوگوں کی تسبیح وتقدیس سے ہم پاک نہیں ہوں گے بلکہ اس سے وہی پاک ہونگے'' (۴) انسان کے وہم وخیال سے بھی بالا وبرتر

تمہارے ساتھ اس درجہ کے رحیم وشفیق ہیں اب عادت مصلحین کی یہ ہے کہ توبہ کی ضرورت ثابت کرنے کے لیے عذاب کو یاد دلاتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ طبائع ضعیف ہوگئی ہیں اس واسطے عذاب کے یاد دلانے سے اندیشہ ہے کہ ان کو حضرت حق سے وحشت نہ ہوجائے بلکہ بجائے اس کے میرے نزدیک ان کے اندر حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت پیدا کرنا چاہیئے، یا ان کو اللہ تعالیٰ کی محبت یاد دلانا چاہیئے کہ تم سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے۔ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے محبت پیدا کرنا چاہیئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خوشی کا درجہ جو اس شخص کو اونٹنی کے مل جانے پر ہوئی ہمارے سمجھانے کے لیے بیان فرماتے ہیں۔ کہ جب اس شخص کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنی اونٹنی کو اپنے پاس کھڑا دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور فوراً اٹھ کر اونٹنی کی لگام پکڑلی۔ اب خوشی چھلکتی ہے تو آپ فرماتے ہیں اے اللہ آپ میرے بندہ ہیں اور میں آپ کا رب ہوں۔ کہنا تو چاہتا تھا کہ میں آپ کا بندہ ہوں، آپ میرے رب ہیں مگر مارے خوشی کے زبان پلٹی جاتی ہے اس لیے کچھ کا کچھ نکل گیا۔ مگر حق تعالیٰ جل جلالہٗ اس پر کچھ نہیں فرماتے ان کے نزدیک یہ خطا بھی نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خونِ شہیداں را از اب حیات اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست (۱)

## حکایت شبان موسیٰ علیہ السلام

مولانا نے مثنوی میں شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ لکھا ہے کہ ایک چرواہا تھا۔ وہ ایک بار جنگل میں بکریوں کو چرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اے اللہ میاں تو اگر مجھے مل جائے تو میں تجھ کو روغنی روٹیاں کھلاؤں، تیرے منّے منّے ہاتھ چوما کروں، تیرے پیر دبایا کروں۔ اس طرح وہ محبت کے جوش میں بھرا ہوا جو جی میں آتا تھا کہہ رہا تھا اتفاق سے اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی آنکلے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

زیں نمط بیہودہ میگفت آں شباں گفت موسیٰ با کیستت اے فلاں (۲)

جیسے دہلی کا قصہ ہے کہ وہاں ایک فقیر بازار میں کھڑا کہہ رہا تھا کہ نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ۔ اور لوگ اس کے چاروں طرف جمع تھے اور کافر کافر کہہ رہے تھے۔ اتفاق سے

(۱) ''شہیدوں کا خون آبِ حیات سے افضل ہے یہ خطا صد صواب سے بہتر ہے'' (۲) ''اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کررہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے''

ایک سمجھدار شخص کا بھی ادھر گزر ہوا تو اس نے فقیر سے دریافت کیا کہ یہ خطاب کس سے کررہے ہو۔ وہ کہنے لگا خدا کا شکر ہے کہ دہلی میں ایک شخص تو سمجھ دار ملا۔ بات یہ ہے کہ میرے نفس نے آج کھیر کی خواہش کی تھی میں نے نفس کی اس خواہش کو پورا نہیں کیا اس نے پھر تقاضا کیا تو میں نے کہا کہ نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ جو میں تیرا کہنا مانوں۔ توبہ توبہ میں خدا تعالیٰ کو کیوں کہتا۔ تو اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا ؎

گفت با آنکس کہ مارا آفرید ایں زمیں چرخ از و آمد پدید(۱)

اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ میرا پیدا کرنے والا کوئی ہے اور وہ وہی ہے جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا کیونکہ یہ امور فطری ہیں اس میں کسی عالم یا جاہل کی تخصیص نہیں ؎

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی خود مسلماں ناشدہ کافر شدی(۲)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرا تو ایمان جاتا رہا تو خدا کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہیں بس پھر کیا تھا یہ سنتے ہی اس کے ہوش وحواس جاتے رہے اور کہا ؎

گفت اے موسیٰ دہانم دوختیدز پشیمانی تو جانم سوختی (۳)

کہ آپ کی تنبیہہ سے میرا تو منہ بند ہوگیا اور پشیمانی نے میری جان کو پھونک دیا۔ خیر حسب عادت جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو وہاں اس پر سوال ہوا کہ آپ نے ہمارے بندے کا منہ بند کیوں کردیا، مولانا فرماتے ہیں ؎

وحی آمد سوئے موسیٰؑ از خدا بندۂ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی (۴)

(۱) ''چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات کررہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں'' (۲) ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے افسوس تو برباد ہوگیا تو خود مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہوگیا'' (۳) ''چرواہے نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تو نے میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے تو نے میری جان کو جلادیا'' (۴) ''موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی وحی آئی کہ تم نے میرے بندے کو مجھ سے کیوں جدا کیا آپ تو لوگوں کو اللہ سے ملانے کے لیے آئے ہیں چھڑانے کے لیے نہیں۔

کہ آپ لوگوں کو ہم سے چھڑانے آئے ہیں یا ملانے۔

ہر یکے را اصطلاحے دا دہ ایم ہر یکے راسیرتے بنہادہ ایم
موسیا آداب داناں دیگرند سوختہ جان و رواتاں دیگرند

یعنی ہر شخص کا جدا جدا حال ہے۔ عارفوں کے لیے آداب الگ ہیں اور ناواقفوں کے آداب الگ ہیں اسی پر مولانا فرماتے ہیں۔

خون شہیداں از آب حیات اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست (۱)

اسی طرح یہ شخص جب اونٹنی مل گئی تو شدت فرح میں کہنے لگا کہ میں تیرا رب ہوں مگر حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ اس سخت کلمہ سے بھی ناراض نہیں ہوئے بلکہ معاف فرماتے ہیں۔ اس جملہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بیان فرمایا کہ اس جملہ سے اس شخص کی انتہا درجہ کی خوشی معلوم ہوئی۔

ایک تیسری حدیث ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے جب اس کو تنبہ ہوا تو اوّل ایک راہب کے پاس گیا جو کہ گویا اس وقت کی اصطلاح کے اعتبار سے شاہ صاحب تھے ان سے جا کر اپنا حال بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں اب میں توبہ کرنا چاہتا ہوں کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ میری توبہ قبول ہوجائے۔ راہب نے جواب دیا کہ نہیں تیری توبہ قبول نہیں ہوسکتی اس نے تلوار سونت کر ان کے بھی ایک ہاتھ دیا جس سے راہب کا کا تمام ہوگیا کہ جب توبہ بھی نہیں تو کسر ہی کیوں رکھی پورے سو ہی کیوں نہ کردوں اس کے بعد پھر اس شخص کو توبہ کی فکر ہوئی۔ راہب کا فتویٰ اس کے جی کو نہ لگا اور واقعی غلط بات کو مومن کا دل قبول نہیں کرتا۔ اب وہ ایک عالم کے پاس گیا۔ حدیث میں اس جگہ عالم کا لفظ آیا ہے اور وہاں راہب کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم ہمیشہ سے محقق ہوتے آئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ بھی شاہ صاحب ہوتے تو ایسا جواب ہرگز نہ دے سکتے۔ مگر عالم کا ترجمہ مولوی نہیں کیونکہ مولوی تو ایسے بھی ہوتے ہیں۔

ایھا القوم الذی فی المدرسہ کل ما حصلتموہ الوسوسہ
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بزدا یدت
ایں ہو سہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(۱) ''شہیدوں کا خون آبِ حیات سے افضل ہے اور یہ غلطی سو صواب سے بہتر ہے''

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
علم چوں برتن زنی مارے بود علم چوں بر دل زنی یارے بود
بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید واوستا(۱)

جب اطاعت میں انسان کمال پیدا کرتا ہے تو یہ ثمرہ حاصل ہوتا ہے کہ بے کتاب کے اس کو علم حاصل ہوتے ہیں پس حدیث میں یہ علم اور ایسا عالم مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں اس کی صحبت کو غنیمت سمجھو۔ ایک یہ کہ وہ فقیہہ ہو۔ دوسرے محدث ہو۔ تیسرے صوفی ہو۔ تو وہ راہب کوئی محقق نہ تھا بلکہ شاہ صاحب تھے جس کی نظر ناتمام تھی۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی جس سے محقق اور غیر محقق کا فرق معلوم ہوجائے گا۔ مگر غیر محقق کا میں نام نہ لوں گا۔

## ایک غیر محقق شیخ کی حکایت

ایک مولوی صاحب نے جو رامپور کے رہنے والے اور میرے ساتھ موجز میں شریک تھے۔ یہ حکایت بیان کی رامپور میں ایک صاحب قبض (۲) میں مبتلا ہوگئے ان کو اپنے متعلق خیال ہوگیا کہ میں مردود شیطان ہوگیا ہوں۔ اس زمانہ میں رامپور میں ایک مولوی صاحب تھے جو کہ صاحب ارشاد بھی تھے۔ وہ شخص اتفاقاً ان کے پاس گیا مولوی صاحب نے پوچھا تم کون ہو وہ بولا شیطان ہوں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا اگر شیطان ہے تو لا حول ولا قوۃ الا باللہ اس جواب سے اس شخص پر ایسی مایوسی طاری ہوئی کہ اس نے خودکشی کرلی۔ سچ ہے کہ ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد(۳)

(۱) ''اے وہ لوگو! جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ تم نے حاصل کیا محض وسوسہ ہے علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کرے یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف وعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کردیتا ہے تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی۔ علم اگر بدن پر مارو تو سانپ بن جاتا ہے اور دل میں ڈالو تو دوست بن جاتا ہے۔ تم اپنے اندر انبیاء کے علوم بغیر کتاب، بغیر معید اور بغیر استاد کے پاؤ گے'' (۲) تصوف کی اصطلاح (۳) ''بغیر دوست کے زندگی ایسی نہیں رہتی اور دوست کے بغیر ذوق ایسا نہیں رہتا''

یہ حکایت انہوں نے موجز کے سبق میں ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیان کی تھی مولانا نے فرمایا کہ ہم تو سمجھے تھے کہ وہ واقعی شیخ ہوں گے۔ مگر اس جواب سے معلوم ہوا کہ ہمارا گمان غلط تھا۔ ان کو یہ جواب دینا تھا کہ اگر شیطان ہو تو کیا ہوا۔ شیطان بھی تو اسی کا ہے۔ نسبت اب بھی باقی ہے۔ اس سے اس شخص کا قبض (۱) بالکل کھل جاتا اور خودکشی سے بھی محفوظ رہتا۔ اب یہاں پر ایک اشکال علمی ہے جو حل طلب ہے کہ اس سے اس شخص کو شفا کیسے ہوجاتی اور قبض کیسے کھل جاتا۔ اس لیے کہ جو نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ مطلوب ہے وہ تو وہ نسبت ہے جو قرب کی نسبت ہو اور شیطان کی نسبت تو بُعد (۲) کی نسبت تھی، جب بعد کی نسبت ہے تو بُعد موجب تسکین (۳) کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ طبیب کو کبھی مقصود صرف معالجہ ہوتا ہے تحقیق مقصود نہیں ہوتی۔ جیسے ایک طبیب کے پاس کوئی شخص آئے۔ جس کو ہچکی لگ رہی ہے اب ایک تو تحقیق ہے کہ اس سے تمہاری ہچکی جاتی رہے گی۔ مگر وہ طبیب جانتا ہے کہ کسی کام میں لگ جانے یا سوچنے سے کوئی فکر شدید پیدا نہ ہوگی بلکہ یہ ایسا ہی کوئی بھی شغل اختیار کرے گا۔ لہٰذا اس نے بجائے اس کے ایک دوسری تدبیر اختیار کی جو کہ تحقیق نہ تھی بلکہ معالجہ تھا۔ جس کی حقیقت ایک حکایت سے معلوم ہوگی۔

## ہچکی بند کرنے کی عملی تدبیر

وہ حکایت ایک طبیب کی ہے جو اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک شخص میرے پاس آیا کہ صاحب فلاں شخص کو ہچکیاں آرہی ہیں، بند ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے اس شخص کا حال سنا اور سن کر کہا کہ اس کا تو آخری وقت ہے اب یہ بچے گا نہیں ہچکیوں ہی میں اس کا کام تمام ہوگا۔ اس کو جب اس جواب کی اطلاع ہوئی فوراً ہچکی بند ہوگئی۔ مجھ سے آکر تیماردار نے اطلاع کی میں نے کہا کہ بھائی خدا کا شکر کرو اب وہ بچ گیا۔ اس نے جاکر بیمار سے یہ میرا قول نقل کیا۔ یہ سننا تھا کہ اس کو ہچکیاں پھر جاری ہوگئیں، پھر میرے پاس آیا میں نے کہا کہ بھائی تمہاری خاطر سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ بچ گیا۔ ورنہ میری تو وہی رائے ہے جو پہلے تھی۔ اس شخص نے جاکر پھر اس سے یہ کہہ دیا۔ یہ سنتے ہی پھر ہچکیاں بند ہوگئیں۔

(۱) اس کی وہ کیفیت جس کی وجہ سے اپنے کو مردود سمجھ رہا تھا دور ہوجاتی (۲) شیطان کو اللہ کا قرب حاصل نہیں بلکہ دوری ہے (۳) دوری سکون کا باعث کیسے ہوسکتی ہے۔

ایسے ہی حکایت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ہے کہ ایک بار آپ تراویح پڑھا رہے تھے پیچھے ایک منشی صاحب تھے ان کو ہچکیاں آنے لگیں، بند ہی نہ ہوں۔ مولانا نے سلام پھیرا تو ان منشی صاحب سے فرمایا کہ منشی جی کچھ خبر بھی ہے کہ ہچکی سے وضو رہتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ کہہ کر نیت باندھ لی۔ اب منشی جی کو اپنی نماز کی فکر ہوگئی بس ہچکیاں بند ہوگئیں۔ جب مولانا نے سلام پھیرا تو انہوں نے مولانا سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو مولانا نے فرمایا کہ اب ہچکیاں کہاں ہیں۔

تو مشائخ محققین کے یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک علمی تحقیق دوسرے عملی تدبیر تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ شیطان بھی اسی کا ہے۔ یہ جواب تحقیق نہ تھا بلکہ ایک تدبیر تھی، معالجہ تھا۔ طبیب اپنے ذوق اختیاری سے سمجھتا ہے کہ یہ عنوان ہی نافع ہوجائے گا۔ معنون کی کاوش کی طرف التفات نہ کیا جائے گا۔ اسی واسطے اہل فن پر ردوقدح نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بہت سے افعال ان مشائخ کے محض تحقیق ہی پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ بطور معالجہ کے ہوتے ہیں۔

## ایک قسم کا دوام

اسی طرح ایک دوسرا قصہ مولانا یعقوب صاحبؒ کا ہے کہ ایک شخص نے مولانا سے شکایت کی کہ حضرت کیا کروں، چاہتا ہوں کہ معمول ناغہ نہ ہو مگر بعض اوقات ناغہ ہو ہی جاتا ہے اور معمول پر دوام حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بھی ایک قسم کا دوام ہی ہے کہ کبھی معمول ادا ہوا کبھی نہ ہوا اسی طرح یہاں بھی اشکال ہوتا ہے کہ دوام مطلوب تو یہ نہیں ہے، پھر مولانا نے اس کو دوام میں کیسے داخل فرمایا۔ اس کا حل بھی یہی ہے کہ مولانا کا مقصود اس وقت تحقیق بیان کرنا نہ تھا بلکہ اس شخص کا علاج کرنا مقصود تھا۔ مولانا ذوقاً سمجھ گئے کہ اگر میں نے اس کے سامنے تحقیق کو بیان کیا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ یعنی اس کی ہمت گھٹ جائے گی۔ اور جو کچھ ذکر کی توفیق اب ہوتی ہے وہ بھی نہ ہوگی۔ بالکل ہی ذکر چھوڑ بیٹھے گا۔ اور اگر اس صورت کو بھی دوام میں داخل کردوں گا اس کا جی بڑھ جائے گا پھر رفتہ رفتہ اس کو حقیقی دوام کی بھی توفیق ہوجائے گی۔ اب سینکڑوں ملفوظات حل ہوگئے (اور ہزاروں اشکال کا جواب ہوگیا)۔

## نیک صحبت کی برکت

اب آپ کو محقق وغیر محقق کا فرق معلوم ہوگیا تو سمجھئے کہ راہب بزرگ تھا مگر غیر

محقق تھا اور وہ عالم محقق تھا۔ عالم سے جب اس نے دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ہاں تیری توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ تجھ میں اور توبہ میں کون سی چیز حائل ہے۔ پھر فرمایا انطلق الی ارض کذا و کذا یعنی مگر توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے ملک کو چھوڑ دے (یعنی اپنے وطن کو) کیونکہ یہ سرزمین اس قابل نہیں کہ یہاں سکونت اختیار کی جائے۔ اور فلاں زمین میں جاکر بودوباش اختیار کر۔ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو بھی جاکر ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کر۔ گویا ان عالم صاحب کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ صحبت بد کو چھوڑ کر صحبت نیک اختیار کر کیونکہ صحبت نیک وہ چیز ہے ؎

گر تو سنگِ خارۂ مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی(۱)

تاتوانی شو از یار بد یار بد بدتر بود از مار بد

مار بد تنہا ہمیں برجاں زند یار بد برجاں وبرایماں زند(۲)

آج کل ایسے بہت لوگ پھر رہے ہیں جو مسلمانوں کا مال بھی لیتے ہیں اور ایمان بھی اور فتنہ وفساد پیدا کر کے مسلمانوں کی جانیں بھی ضائع کراتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نذر ونیاز کے لیے پیری مریدی پھیلانے کے لیے محققین کو برا بھلا کہتے پھرتے ہیں، اس پر مجھ کو ایک قصہ یاد آیا۔ جب نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تو میں نے اول ان سے چند شرطیں کیں۔ خیر اس کے بعد جب میں وہاں پہنچا اور بدعات کی مذمتیں بیان میں آئیں تو ایک گفتگو کے سلسلہ میں نواب صاحب کہنے لگے کہ صاحب یہاں تو جو آتے تھے ہم سے سجدہ کراتے تھے اور یہ بھی کہا کہ صاحب یہاں پر جو لوگ آتے ہیں ہمارا مال بھی لے جاتے ہیں۔ ایمان بھی لے جاتے ہیں یہ ہیں یار بد برجان وبرایمان زند(۳) کے مصداق۔ بہرحال وہ عالم محقق تھے۔ ان عالم صاحب نے اس وقت اس کو طریق توبہ کی تعلیم دی۔ اس کی تفصیل نہیں بتلائی۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں توبہ کے کیا کیا شرائط تھے۔ بہرحال انہوں نے تفصیل نہیں بتلائی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ پہلے اس کے اندر توبہ کی استعداد پیدا کرنی چاہیئے اور

(۱) ''اگر تم سخت پتھر اور سنگِ مرمر بھی ہوں گے جب اہل اللہ کے پاس پہنچو گے تو موتی ہوجاؤ گے'' (۲) ''حتی الوسع برے ساتھی سے دور رہو، برا یار سانپ سے بھی بدتر ہے۔ برا سانپ صرف جان سے محروم کردیتا ہے، بُرا دوست جان اور ایمان دونوں سے محروم کردیتا ہے'' (۳) برا دوست جان وایمان دونوں کو ہلاک کردیتا ہے

طاعات بجالانے اور مشقتوں کے تحمل کرنے کا اس کو عادی بنانا چاہیئے پھر تفصیل توبہ کی خود ہی معلوم کرے گا۔ اس محقق کا مذاق یہی تھا کہ پہلے محبت پیدا کرو پھر کام کی تفصیل بتلاؤ۔

## شبہات کا شافی علاج

ایک بار میں چھتاری گیا۔ نواب صاحب چھتاری نے بلایا تھا وہاں میرا بیان ہوا جس میں بہت سے علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ بھی جمع تھے۔ میں نے بیان میں یہ بھی کہا کہ آپ لوگوں نے جو یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ جہاں کسی عالم سے ملاقات ہوئی اور آپ نے اپنے شبہات کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا۔ یہ طریقہ کامیابی کا نہیں اس سے آپ کے مرض کو شفا نہیں ہوسکتی۔ میں بتلاتا ہوں شفا کا طریقہ کیا ہے۔ آپ اپنے قلب کے اندر محبت پیدا کریں۔ محبت وہ چیز ہے کہ اگر ایک عورت کسی فلسفی سے یہ کہے کہ لنگوٹا باندھ کر بازار کے اس سرے سے اس سرے تک گشت لگاؤ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ کسی کا سچا عاشق ہے تو کبھی بھی پس وپیش نہیں کرے گا۔ بھلا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ بی بی تمہاری اس میں کوئی منفعت نہیں اور میری اس میں ذلت ہے بلکہ اگر کوئی دوسرا بھی اس سے وجہ دریافت کرے گا تو یہ فلسفی اس سے بھی یہ کہے گا اجی پوچھو مت کہیں اس کی رائے نہ بدل جائے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ایک تدبیر تو بتلادی ہے اپنے ملنے کی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بد(۱)

تو دیکھئے اُس کسبی کے امر وعمل میں اس شخص کو وسوسہ تک نہیں ہوا کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ نہ خود اس سے حکمت پوچھتا ہے نہ کسی دوسرے کو پوچھنے دیتا ہے، نہ کسی کے اعتراض پر توجہ کرتا ہے تو یہاں کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے وسوسہ تک بھی نہ آیا۔ یہ محبت تھی اور کچھ نہیں۔

## اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کی آسان تدبیر

اب رہا یہ سوال کہ محبت حق پیدا کیونکر ہو تو میں نے کہا میں تم کو ایسی آسان بات بتلاتا ہوں کہ سارے علی گڑھ کی تعلیم میں ایسا آسان سبق آج تک تم کو نہ ملا ہوگا۔

(۱) ''مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اس کے عشق میں کوچہ میں پھرنا زیادہ بہتر ہے''

وہ یہ کہ محبت والوں کے پاس بیٹھنا شروع کردو غدر سے پہلے ہمارے ضلع میں ایک ڈپٹی نصراللہ خان صاحب تھے جو کہ خود مستقل شیخ تھے اور ہمارے حضرات کو دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بیاض میں جس کا نام دل کشا ہے، ان ہمارا حضرات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد فی الحال بصورتِ طلا شد

تو صحبت عجیب چیز ہے غرض اس عالم کے کہنے کے موافق وہ بیچارہ اپنی بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی کی طرف چلا اور آدھے ہی راستہ پر پہنچا کہ موت کا وقت آ گیا ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

اب وہ بیچارہ کیا کرتا مجبور تھا۔ اور کچھ تو اس سے ہو نہ سکا۔ بس اپنے سینہ کو اس دوسری زمین کی طرف بڑھا دیا چونکہ اس نے توبہ کا سامان شروع کر دیا تھا مگر ظاہراً ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اس لیے رحمت کے فرشتے بھی آئے اور عذاب کے بھی، ملائکہ رحمت تو کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ اس نے توبہ کا سامان کرنا شروع کر دیا ہے اور ملائکہ عذاب کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ ابھی توبہ مکمل نہیں ہوئی۔

## ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں

اب یہاں سے میں نے ایک مسئلہ علمی مستنبط کیا ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ ملائکہ کو بھی احکام بطور کلیات کے ملتے ہیں اور ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ جزئیات کو ان پر منطبق کرلو۔ پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حکم جزئی ہوتا تو ایک جماعت آتی۔ دو جماعتیں کوئی لڑنے کے واسطے تھوڑا ہی آئی تھیں۔ خیر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لیے آیا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اچھا زمین کو دونوں طرف سے ناپا جائے۔ اگر یہ اپنی زمین سے زیادہ قریب ہے تب تو ملائکہ عذاب اس کی روح کو لے جائیں۔ اور اگر دوسری زمین سے زیادہ قریب ہے تو ملائکہ رحمت لے جائیں اور وہ واقع میں قریب تھا اپنی ہی زمین کے، روایات میں آیا ہے کہ اس کی زمین کو حکم دیا گیا دور ہوجا اور دوسری زمین کو حکم دیا گیا کہ قریب ہوجا چنانچہ ناپا گیا تو ایک بالشت اس دوسری زمین سے قریب تھا۔ یہ برکت تھی اس کے عمل کی کہ اس نے اپنے سینے کو مرتے وقت دوسری زمین کی طرف قریب کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت اس کو اتنی ہی قدرت تھی۔

تو بندہ کو چاہئے ہمت کرے پھر اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ خود کر لیتے ہیں۔ جیسے باپ دیکھ لیتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا اور اس کو گود میں اٹھالیتا ہے تو جیسے باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی، اسی طرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہم تو سِرکتے (۱) ہی نہیں اپنی جگہ سے۔ اور حق تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ چل کر گرا بھی ہے یا نہیں وہ صرف طلب کو دیکھتے ہیں پھر خود ہی امداد فرماتے ہیں ورنہ بغیر ان کی امداد کے بندہ کیا کرسکتا ہے ؎

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید ہاں مگر لطف شاپیش نہد گامے چند
نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می مالد بخود ایں راہ چوں تاک از دبردنہا

تو یہ طریق تو انہیں کے قطع کرنے سے قطع ہوسکتا ہے۔

## حق تعالیٰ شانہٗ صرف طلب دیکھتے ہیں

حدیث شریف میں آیا ہے من تقرب الیّ شبراً تقربت الیه ذراعاً (۲) چنانچہ اس شخص کا ایسا ہی قصہ ہوا کہ اس نے صرف اپنا سینہ بڑھادیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سچ مچ دوسری زمین کی طرف ایک بالشت بھر قریب کردیا۔ اگر چاہتے تو اور قریب کردیتے مگر پھر رحمت کیسے ظاہر ہوتی کہ اتنے تفاوت سے بھی رحمت کو غلبہ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی مولوی کو شبہ ہو کہ توبہ سے حقوق العباد کیسے معاف ہوگئے کیونکہ مولویوں کو شبہات بہت ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے قیامت کے دن مقتولین کو اتنا خوش کردیا جاوے کہ وہ خوش ہوکر خود ہی معاف کردیں۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے غالباً اپنے رسالہ حقوق الاسلام میں لکھا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو بڑے بڑے عالی شان محل دکھلائے جائیں گے اور ندا کی جائے گی کہ کوئی ان کو خریدتا ہے اہل محشر عرض کریں گے کہ ان کی قیمت کون دے سکتا ہے۔ حکم ہوگا کہ نہیں ان کا لینا بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی پر کسی کا حق رہ گیا ہو وہ معاف کردے، اگر کسی نے کسی کی غیبت کی ہو وہ معاف کردے بس محل مل جائے گا۔ بھلا جب حاکم راضی نامہ دلوانا چاہے تو مجال ہے فریقین کی راضی نامہ نہ دیں مگر اللہ تعالیٰ ہم کو راضی

(۱) چلتے ہی نہیں (۲) مسند احمد ۲/ ۴۱۳ کنز العمال: ۱۱۷۹۔

کر کے راضی نامہ دلوانا چاہیں گے جبراً نہیں دلوائیں گے تو اس طرح اس اشکال کا جواب بھی ہوگا تو آجکل تو اتنا گنہگار کوئی بھی نہیں جتنا یہ شخص تھا جس کا قصہ حدیث شریف سے ابھی معلوم ہوا۔ جب اس کی توبہ بھی قبول ہوگئی تو کون ایسا ہے جس کی توبہ قبول نہ ہو۔

چوتھی حدیث جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص نے گناہ کیا اس کے بعد پھر توبہ کی اور کہا اللھم اغفر لی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کیا میرا بندہ جانتا ہے اس کا کوئی رب ہے جو گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ سبحان اللہ کیا لطف اور رحمت ہے کہ اتنی بات پر مغفرت فرمادیتے ہیں جیسے کسی ممتحن نے ایک طالب علم سے سوال کیا کہ بتلاؤ حروف جارہ کون کون سے ہیں اس طالب علم نے بجائے حروف جارہ کے حروف ناصبہ بتلادیئے اس پر ممتحن نے اس کو تنبیہہ کی تو ایک صاحب نے طالب علم کی حمایت کی کہ صاحب آخر جس فن کا سوال تھا اسی فن کا مسئلہ تو بتلایا ہے کوئی سکندر نامہ کا شعر تو نہیں پڑھ دیا۔ اسی طرح ایک بادشاہ کے لڑکے کا شرح جامی میں امتحان لیا گیا۔ پوچھا گیا بتلاؤ اَلْحَمْدُ لِوَلِیِّہٖ میں واؤ کیسا ہے شہزادہ کہتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے۔ بادشاہ نے جو یہ سنا تو لاکھوں روپیہ خیرات کیا کہ میرا لڑکا یہ تو جانتا ہے کہ واؤ عاطفہ بھی کوئی چیز ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ پر بھی رحمت کا کوئی چھینٹا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح حق تعالیٰ اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ میرا بندہ تو یہ جانتا ہے کہ میرا بخشنے والا بھی کوئی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ بندہ پھر گناہ کرتا ہے اور اس کے بعد پھر توبہ کرتا ہے پھر حق تعالیٰ خوش ہو کر یہی فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرا بخشنے والا کوئی ہے۔

پانچویں حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص نے قسم کھا کر کہا فلاں شخص کی بخشش نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ تو کون ہوتا ہے جو تو نے میرے متعلق قسم کھا کر کہا کہ میں اس شخص کو نہ بخشوں گا، جا میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے اعمال حبط کر دیئے۔

## حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جیسے بوستان میں ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک عابد جارہا تھا ایک گنہگار شخص نے دیکھا وہ بھی ساتھ ہوگیا اور دعا کی مجھ کو بخش دیجیو۔ عابد نے نفرت ظاہر کی اور دعا کی کہ اے اللہ اس کو اور مجھ کو ایک جگہ جمع نہ کیجیو۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی گئی کہ ان سے کہہ دو کہ ہم نے دونوں کی دعائیں قبول کیں اس گنہگار کو بخش دیا اور

جنت دی اور اس عابد کو اس کے ساتھ جمع نہ کریں گے اس لیے اس کے لیے جہنم تجویز کر دیا۔

چھٹی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص تھا گنہگار جب وہ مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹوں سے وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو مجھ کو جلا دینا۔ اب چاہے اس کے مذہب میں جلانا جائز نہ ہو مگر اس پر حال کا غلبہ تھا اس نے کہا مجھ کو جلا دیا جائے تو اچھا ہے پھر جلا کر میری راکھ پسوائیں اس کے بعد راکھ کو ہوا میں اڑا دیں یا تو اس طرح بچ گیا اور اگر پھر بھی ہاتھ آ گیا تو ایسی سزا ہوگی جو کسی کو نہ ہوئی ہوگی۔ اس کے بیٹوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ مرا اس کو جلا کر ہوا میں اڑا دیا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کے بدن کے تمام ذرات جمع کرو چنانچہ پھر وہ شخص زندہ ہو گیا پوچھا گیا بتلاؤ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کہا اے اللہ تیرے خوف سے کیا۔ حکم ہوا جاؤ ہم نے بخش دیا۔ اب یہاں پر شبہ ہوتا ہے کہ کیا وہ عموم قدرت کا قائل نہ تھا اگر نہیں تھا تو مومن کیسے ہوا پھر اس کی مغفرت کیسے ہوگئی۔ تو جواب یہ ہے کہ اس کے اندر اتنی عقل نہ تھی جو وہ یہ سمجھتا کہ عموم قدرت کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس کا مکلف ہی نہ تھا۔ جیسے یہاں کا قصہ ہے کہ یہاں ایک بڑی بی تھیں ایک مرتبہ وہ مجھ سے دریافت کرنے لگیں کہ مولوی جی تمہیں تو اللہ کے گھر کی سب خبر ہے بھلا میں یہ پوچھوں ہوں کہ اللہ میاں زندہ ہیں (توبہ توبہ)۔

دوسری بیبیاں اس بات کو سن کر ہنسنے لگیں۔ میں نے کہا ہنسو مت اس کو سمجھاؤ، میں نے کہا بڑی بی یہ تو بتلاؤ کہ بارش کون کرتا ہے کہا اللہ میاں، میں نے کہا اور رزق کون دیتا ہے کہا اللہ میاں، میں نے کہا اولاد کون دیتا ہے کہنے لگیں اللہ میاں۔ صاحبو یہ سب امور فطری ہیں ان سب سوالات کے جواب میں ہر جاہل سے جاہل یہی کہے گا کہ یہ کام خدا کے ہیں تو میں نے کہا بڑی بی کیا مرنے کے بعد بھی کوئی کچھ کام کیا کرتا ہے۔ کہنے لگیں ہاں اب سمجھ گئی۔ اسی طرح یہاں ایک اور بڑی بی تھی ان کو فقر و فاقہ رہتا تھا۔ ایک بار وہ مجھ سے اپنے فقر و فاقہ کا حال بیان کرنے لگیں جب سب کچھ کہہ چکیں تو کیا کہتی ہیں کہ میں زیادہ کہتی بھی نہیں کبھی اللہ میاں کہیں میرے عیب کھولتے پھرتے ہیں (توبہ توبہ)

اسی طرح قصبہ بَنْت کا ایک قصہ ہے ایک بی بی تھیں انہوں نے وعظ میں سنا کہ صور پھونکا جائے گا اور سب چیزیں فنا ہو جائیں گی تو وہ کیا کہتی ہے ہائے اللہ میاں اکیلے رہ جائیں گے ان کا جی نہ گھبرائے گا (توبہ توبہ)

تو صاحبو! یہ لوگ بیوقوف ضرور ہیں مگر ایسے بیوقوف ہیں کہ کودتے پھاندتے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اور بڑے بڑے محققین دیکھتے ہی رہ جائیں گے اور تمنا کریں گے کاش ہم بھی ایسے ہی بیوقوف ہوتے۔ تو ایسوں کو عقلیات کا مکلف کہنا درحقیقت تکلیف مالا یطاق کے جواز کا قائل ہونا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک لونڈی کو اس کے آقا نے بہت مارا تھا پھر نادم ہو کر اس کو آزاد کرنا چاہا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ این اللّٰہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں اس نے جواب دیا فی السمآء آسمان میں ہیں، پھر آپ نے ارشاد فرمایا میں کون ہوں کہا آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو آزاد کردو یہ مومنہ ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کیا اس نے آسمان کے وہی معنی لیے تھے جو ہم لیتے ہیں، اجی وہ بیچاری کیا جانے تھی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ اس میں عقل اتنی ہی تھی اسی طرح اس واقعہ میں سمجھ لیا جائے کہ اس شخص کو عموم قدرت کی سمجھ نہ تھی اس لیے اس کے ایمان میں خلل نہ تھا بلکہ خدا کا خوف اس کے دل میں تھا جو ایمان کی علامت ہے اس خوف کی وجہ سے جو صورت عذاب سے بچنے کی اس کی عقل میں آئی اس نے وہی اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان اور خوف وخشیت کی برکت سے اپنی رحمت سے بخش دیا۔

## گناہوں سے بچنے کا سب سے عمدہ وآسان طریقہ

ان احادیث سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کس قدر وسیع ہے اور وہ کیسے قدر دان ہیں حتی کہ جب بندہ اللھم اغفرلی کہتا ہے تو اتنی بات سے خوش ہوجاتے ہیں کہ میرے بندہ کو خبر ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے تو صاحبو اللھم اغفرلی کہنے میں کیا محنت پڑتی ہے کچھ بھی نہیں تو کیا اب بھی گناہوں سے پاک ہونے کو دل نہیں چاہتا یہ تو بڑا آسان نسخہ ہے لہٰذا میں سب کو خطاب کرکے کہتا ہوں کہ سب لوگ اپنے گناہوں کو توبہ استغفار کرکے بخشواتے رہیں اس سے بُعد گھٹے گا پھر اس سے محبت بڑھے گی پھر اس محبت کا اثر یہ ہوگا کہ گناہ ہی نہ ہوں گے تو گناہ سے بچنے کا سب سے عمدہ اور آسان طریقہ یہ ہے کہ توبہ کرتے رہو، اب دعا کرو اللہ میاں توفیق عمل عطا فرمائیں۔

# أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی

ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

۱۔ جامعہ ہذا میں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد نصابی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔طلباء نے ایک نئے جوش وجذبے کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے، جن طلباء نے امتحانات دئے ہوئے تھے ان میں سے نویں جماعت کے طلباء کا نتیجہ بھی آچکا ہے اور اس سال جامعہ کے طلباء نے نویں جماعت میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔اللہ تعالی تمام طلباء کو دین و دنیا کے ہر امتحان میں کامیابیاں نصیب کرے۔

۲۔ رئیس جامعہ حضرت قاری احمد میاں تھانوی صاحب دامت برکاتہم کو امسال بحمد اللہ ایک بار پھر شاہی دعوت پر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی جہاں حضرت نے شاہی مہمانان گرامی کے ہمراہ حج کے فرائض ادا فرمائے۔عالمی لجنۃ التحکیم کی مجالس میں شرکت فرمائی اور شیخ القراء ابراہیم احضر دامت برکاتہم کے گھر مشرق ومغرب کے قراء کرام سے خصوصی ملاقاتیں بھی کیں۔

۳۔ کچھ انتظامی رکاوٹوں کے پیش نظر رواں سال جامعہ دار العلوم الاسلامیہ میں اجتماعی قربانی کا اہتمام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے متعلقین و احباب کو قربانی کے فرائض کی ادائیگی میں کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، جامعہ کے سربراہان و انتظامیہ کو با خوبی اندازہ ہے کہ جامعہ کی طرف سے کی جانے والی اجتماعی قربانی اہل محلہ کے لئے کس قدر نعمت عظمی کا کردار ادا کرتی ہے لیکن جامعہ کی اپنی مجبوریاں ہیں آپ حضرات سے صرف دعا کی درخواست ہے کہ

اللہ رب العزت جامعہ کی پریشانیوں کو دور فرما کر تمام خدمات بحسن وخوبی جاری وساری فرمائے۔امید کرتے ہیں معاونین کے تعاون سے یہ گلشن سدا یوں ہی شاداب رہے گا ان شاءاللہ۔

۴۔ الحمد للہ حضرت مولانا مشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کے مواعظ کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور حضرت کا اگلا وعظ ''حصول علم دین'' طبع ہوکر آچکا ہے شائقین ادارہ اشرف التحقیق سے حاصل کرسکتے ہیں۔حضرت والا کا یہ معمول تھا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد نماز سے متعلق مسائل کی تعلیم فرمایا کرتے تھے، بہت ہی سہل انداز میں معرکۃ الآراء مسائل حل فرما دیتے تھے۔اس مرتبہ شائع ہونے والے وعظ کے آخر میں حضرت کی صبح والی ایک مجلس بھی کمپوز کر کے ''معذورین کے احکام'' کے عنوان سے شائع کی گئی ہے امید ہے کہ قارئین کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی ان شاءاللہ۔

۵۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کے ایماء پر شروع کی گئی دراسات کی کلاس بھی حسب سابق جاری ہے اور نئے داخلے مکمل ہونے کے بعد ایک کلاس کا صبح فجر کے بعد بھی آغاز ہوگیا ہے۔ جو حضرات پورا ہفتہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب نہیں آسکتے وہ اگر صرف ہفتہ کے دن حاضر ہونا چاہیں تو اس کی بھی جامعہ کی طرف سے اجازت مل سکتی ہے۔